شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن

۱۹۴۳

فہرست

بڑی آپا

وہ بھیّا کے ساتھ اکثر ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ کئی سال سے دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ پہلے پہل بھیّا جب اس کی باتیں کیا کرتے تو میرے دل میں گُدگُدی سی ہونے لگتی۔ وہ بڑے فخر سے سینہ پھلا کر کہتے۔ "آج رفیق نے یہ کیا، اتنے نمبر لیے، فلاں کھیل میں حصّہ لیا۔" ویسے بھیّا اور اس کی جوڑی بھی خوب تھی۔ ایک سے قد، ایک سے جسم اور ایک سی عادتیں۔ دونوں سینما کے عاشق، دونوں کھیل کود کے دیوانے۔ جب سائیکلوں پر ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے سڑک پر جاتے تو دُور سے پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ البتّہ ایک فرق نمایاں تھا وہ یہ کہ بھیّا ذرا سانولے تھے اور اس کا رنگ کِھلا ہوا تھا۔ اس لیے جو نیلے اور کالے سوٹ اس کے رنگ کو نمایاں کر دیتے تھے، وہ بھیّا کو اتنے اچھے نہیں لگتے تھے اور ہاں ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ اس کی ناک پر ہر وقت کالے شیشوں کی ایک عینک رکھی رہتی تھی۔ بھیّا کے بتانے پر معلوم ہوا کہ جناب سینما بہت دیکھتے

ہیں جس سے آنکھیں کبھی کبھی سُرخ ہو جاتی ہیں۔ اس لیے یہ عینک لگا رکھی ہے۔

میں اسے چھپ کر شیشوں میں سے اور کواڑوں کی آڑ سے دیکھا کرتی۔ دراز قد، چھریرا اور ورزشی جسم، بکھرے ہوئے بال، چہرے پر ایک عجیب قسم کی معصومیت۔ جب بات کرتا تو بچّوں کا سا بھولا پن چہرے پر آجاتا۔ کچھ ایسا حسین بھی نہ تھا۔ نہ ہی خدوخال ایسے دلکش تھے۔

وہ تقریباً ہر روز ہمارے ہاں آیا کرتا۔ بعض اوقات بھیّا پہلے چلے آتے اور شام کو اس کا انتظار کیا کرتے۔ جس روز وہ نہ آتا بے چین ہو جاتے۔ بار بار دروازے تک جاتے اور گھڑی دیکھتے۔ کبھی مجھ سے وقت پوچھتے اور جیسے ہی اس کے سائیکل کی گھنٹی کی آواز کانوں میں آتی ان کا چہرہ دمک اُٹھتا۔ فوراً دوڑ کر دوسرے کمرے میں چھپ جاتے۔ وہ بھاگا بھاگا آتا، نوکر آگے بڑھ کر کہہ دیتا۔ "وہ تو باہر چلے گئے۔" یہ مذاق ہر بار کیا جاتا مگر وہ ہمیشہ اسے سچ سمجھ لیتا اور واپس مڑنے لگتا۔ بھیّا دوڑ کر اس سے چمٹ جاتے اور پھر جو باتیں شروع ہوتیں تو بس خدا کی پناہ رات کے بارہ بارہ بجے تک دونوں بیٹھے رہتے۔ وہ ریڈیو والے کمرے ہی میں بیٹھے اور ریڈیو کو ہمیشہ بند کر دیتے کہ باتوں میں مخل ہوتا ہے۔ میرا جی بڑا جلتا،

اگر یہ داستان امیر حمزہ چھیڑنی ہے تو اس کمرے میں کیوں بیٹھے ہیں اور پھر ریڈیو بند کیوں کر دیتے ہیں۔ جانتے ہیں نا کہ میں اس بات سے چڑتی ہوں۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں کواڑوں سے لگی ان کی باتیں سن رہی ہوں۔ یکایک کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اگر امّی دیکھ لیں تو کیا کہیں۔ وہاں سے ایسی بھاگتی کہ اپنے کمرے میں آکر دم لیتی۔ توبہ توبہ ایک لڑکی کے لیے اس سے زیادہ اور کیا بے شرمی ہو سکتی ہے؟ میں قسم کھاتی کہ پھر اسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ بھلا اس میں کیا خاص بات تھی آخر؟ یونہی معمولی لڑکوں جیسا تھا۔ بھیّا کو اچھا لگتا تھا تو اس کے معنی یہ تو نہیں کہ مجھے بھی اچھا لگے۔ اور پھر ہر بار میں ہی دیکھتی تھی اس نے کس روز کوشش کی کہ مجھے دیکھے۔

ماشاءاللہ بھیّا میں ویسے تو ساری خوبیاں تھیں، مگر ایک ذرا زیادہ نمایاں تھی۔ وہ یہ کہ سگریٹ اتنی بُری طرح پیتے تھے کہ کوئی حد تھی نہ حساب۔ امّی نے بہتیرا سر کھپایا۔ ابّا نے بہتیرا سمجھایا۔ وہ بھی تمباکو کے نقصانات پر لیکچر دیتا رہا۔ مگر شاباش ہے بھیّا کو ایسے چکنے گھڑے نکلے کہ کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ امّی سے مُنہ بنا کر کہتے۔ ”بھلا کب پیتا ہوں سگریٹ، کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے مجھے پیتے ہوئے۔“ اور

وہ واقعی گھر میں پیتے بھی نہیں تھے۔ میں اور ننھا ہم دونوں ان کے پیچھے جاسوس لگے ہوئے تھے۔

ایک شام کو میں کالج سے گھر ذرا دیر سے پہنچی۔ آہستہ سے پردہ ہٹا کر دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ میری آنکھیں مارے خوشی کے چمک اٹھیں۔ بھیّا ریڈیو کے سامنے آرام کرسی پر میری طرف پیٹھ کے بیٹھے تھے۔ سگریٹ کا دھواں ایک عجیب شان سے نکل رہا تھا۔ ویسے تو اپنی طرف سے پوری مورچہ بندی کی ہوئی تھی۔ کرسی میں دھنسے ہوئے بیٹھے تھے اور بیٹھے بھی کیا تھے بس لیٹے ہوئے تھے۔ سر پر آڑا ہیٹ رکھا ہوا تھا تاکہ دور سے سر اچھی طرح نظر نہ آسکے اور دیکھنے والا یہی سمجھے کہ آرام کرسی کی پشت پر ایک ہیٹ رکھا ہے۔ میں نے آہستہ سے کتابیں میز پر رکھیں اور قالین پر دبے پاؤں آگے بڑھی۔ ایک ہاتھ سے ہیٹ ایک طرف پھینکا اور دوسرے سے سگریٹ چھین لی۔ بھیّا ہڑبڑا کر اٹھے۔ توبہ جو نظارہ میں نے دیکھا بس دھک سے رہ گئی۔ یہ بھیّا نہیں تھے کوئی اور تھا یہ رفیق تھا۔ جو اوڑھنی چھوڑ کر بھاگی ہوں تو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ سامنے سے امّی آرہی تھی، دروازے میں ان سے زور کی ٹکر ہوئی "یا وحشت! آخر یہ بچپنا جائے گا کب؟" انہوں نے ڈانٹ کر کہا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر دم لیا۔ امّی کے لیکچر کی آواز برابر کانوں میں آ رہی تھی۔ رات کو دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ اپنے دل میں کیا کہتا ہو گا کہ یا تو کبھی سامنے نہیں آئی تھی اور یا یکلخت اس قدر بے تکلفی؟ اگر وہ بھیّا سے کہہ دے کہ "جناب! میرا آپ کے گھر سگریٹ پینا آپ کی ہمشیرہ صاحبہ پر ناگوار گزرتا ہے۔" تو بھیّا کیا کہیں گے کہ کتنی بد تمیز ہے۔ مگر پھر ایک عجیب سے خیال نے دل پر سرور طاری کر دیا۔ کچھ بھی ہو آخر اس نے بھی تو مجھے دیکھ لیا تھا اگر کس حلیے میں؟ میں نے اپنے کپڑوں پر نظر ڈالی، چاکلیٹ رنگ کی شلوار، ویسی ہی قمیض اور ویسا ہی دوپٹہ (جو میں وہیں چھوڑ آئی تھی) گویا مجسم چاکلیٹ! میں نے اپنے آپ کو کوس ڈالا۔ میرے پاس بہترین جوڑے موجود تھے۔ اچھی سے اچھی ساڑیاں تھیں۔ کاش میں نے اس روز چمکدار بارڈر والی سبز ساڑھی پہنی ہوتی۔ میرے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سارے دن کی پڑھائی کے بعد کچھ کملایا ہوا سا تھا مگر شاید بجلی کی روشنی میں قدرے گلابی جھلک آ گئی ہو۔

کوئی ہفتہ بعد بھیّا بیمار ہو گئے۔ اچھے بھلے کالج سے آئے۔ شام کو نہ معلوم کیا ہو گیا۔ رات ہوتے پلنگ پر دراز ہو گئے۔ ابّا جان دورے پر گئے ہوئے تھے۔ امّی نوکرانی اور ننھے سمیت دوسرے محلّے میں کسی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں اکیلی

گھبرا گئی، فوراً نوکر کو بھیجا کہ رفیق کو بُلا لائے۔ اس کے سوا اور میں کر ہی کیا سکتی تھی؟ نوکر چلا تو گیا مگر میرے دل میں ایک خیال آتا تھا دوسرا جاتا تھا۔ بار بار یہ سوچتی کہ اس سے بات کیسے کر سکوں گی؟ سائیکل کی گھنٹی بجی، پردہ اٹھا کر وہ اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو کچھ ٹھٹھکا۔ پھر بھیّا کی طرف دیکھ کر لپک کر اندر گیا۔

"یہ کب سے بیہوش ہیں؟" اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ میں نے کچھ جواب دیا۔ بہت سے اور سوالوں کا بھی اُلٹا سیدھا جواب دیا۔ یہ تھی میری اور اس کی پہلی بات چیت۔ وہ بچّوں کی طرح شرما رہا تھا۔ سر جھکائے اور بغیر میری جانب دیکھے کوئی سوال پوچھا اور میں رُک رُک کر جواب دیتی۔ الفاظ میرے حلق میں اٹک رہے تھے۔

پانچ چھ دنوں میں بھیّا اچھے ہو گئے۔ اس کی اَنتھک تیمارداری کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ہم لوگوں میں کافی گھل مل گیا۔ اِدھر ننھا تھا کہ ہر وقت بھیّا رفّو کی رٹ لگائے رکھتا۔ کتنی بار سمجھایا کہ بے وقوف کہیں کے۔ اوّل تو بڑوں کا نام نہیں لیا کرتے اور پھر اگر لیں بھی تو یہ کیا ستم ہے کہ اس بُری طرح سے۔

ہر روز ننھے کی جیب میں چاکلیٹ ہوتے۔ کوئی دن ایسا نہ گزرا کہ جب ننھا اس کے ساتھ سیر کرنے گیا ہو اور چاکلیٹ کی جگالی کرتا ہوا نہ آیا ہو۔ ایک روز میں نے تنگ آ کر کہہ دیا۔ ”آپ ننھے کی عادت بگاڑ رہے ہیں۔ یہ کیا کہ ہر روز سیر کو بھی لے جائیں اور چاکلیٹ بھی لے کر دیں۔ خواہ مخواہ کا بار ہے نا آپ پر!۔“

”تو آپ ننھے کو میرے ساتھ جانے ہی کیوں دیتی ہیں؟ شوق سے روکیے۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ جو کوئی بھی میرے ساتھ رہے گا اس کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔“ وہ ہنس پڑا۔

ایک روز میں کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔ ”تار لیجئے!“ بھیّا دوڑے گئے اور چلا کر بولے۔ ”بڑی آپا آ رہی ہیں؟“

”بڑی آپا آ رہی ہیں سچ مچ؟“ میں نے خوش ہو کر پوچھا۔ بھیّا تار لے کر امّی کو خبر دینے چلے گئے۔

وہ سال بھر کے بعد آ رہی تھیں۔ امتحان پاس کر چکی تھیں، پھر وہی شیخیاں بگھاریں گی۔ میں تو رات بھر سوتی نہیں تھی پڑھتے پڑھتے گردن اکڑ جاتی تھی۔

جب امتحان دیا تو بخار چڑھا ہوا تھا۔ مگر میں بھی خوب جھٹلاؤں گی اس دفعہ، اس ایک سال میں بھی خاصی سمجھدار ہو گئی تھی۔

شام کو آپا آگئیں۔ ہم خوب لپٹ لپٹ کر ملے۔ پھر جو باتیں شروع ہوئیں تو رات کے دو بج گئے۔ یکایک آپا نے ایک عجیب سا سوال کیا۔ ”جو تصویر بھیّا نے مجھے بھیجی تھی، اس میں ایک اجنبی لڑکا بھی تھا۔ کون ہے بھلا وہ؟“

”کوئی دوست ہے ان کا“۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ نام کیوں نہیں بتاتی اس کا؟“

”رفیق ہے اس کا نام!“ میں نے کہا۔

”نام تو بڑا اچھا ہے اور ویسے خود بھی اچھا ہے۔ ہے نا؟“

”مجھے کیا معلوم؟ ہو گا۔“ میں نے مُنہ بنا کر کہا۔

مجھے آپا کی یہ تعریف بڑی ناگوار لگی۔ میں نے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

”کیوں نیند آگئی کیا؟“ وہ بولیں۔

”ہاں۔“

دوسرے روز آپا نے اسے دیکھا۔ باتیں کیں۔ کمرے میں مَیں اور بھیّا بھی بیٹھے تھے مگر کیا مجال جو آپا نے کسی اور سے ایک بات بھی کی ہو۔ رفیق کے پیچھے اس طرح پڑھیں کہ اس غریب کا ناک میں دم آگیا۔ آپا کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی۔ اور رفیق کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ صوفے میں گھسا جارہا تھا۔ بار بار گفتگو کا رخ پلٹتا تھا کہ چھٹکارا ملے۔ اِدھر میں بے چین ہو رہی تھی۔ آخر آپا کا مطلب کیا ہے اس قسم کے سوالوں سے۔ بھیّا سے کب واقفیت ہوئی تھی؟ گھر میں آنا جانا کب سے ہوا؟ یہ لڑکی (میری طرف اشارہ کرکے) تمہیں ستاتی تو نہیں؟ اچھی لڑکی ہے نا؟ تم بڑے شرمیلے ہو؟ کیوں ہو اتنے شرمیلے؟ روز آیا کرتے ہو نا؟ آپا کو کیا ہو گیا تھا؟

اس کے بعد آپا کا زیادہ وقت آئینے کے سامنے گزرنے لگا۔ صبح ہی سے شام کے لیے کپڑے چُن لیے جاتے۔ شام کو سیر سے دو اڑھائی گھنٹے پہلے میک اپ شروع ہو جاتا۔ رفیق بھی پہلے سے زیادہ بن سنور کر آنے لگا۔ بکھرے ہوئے بال سنورنے لگے۔ ٹائی بھی کوٹ کے رنگ کے مطابق ہوا کرتی یا شاید یہ تبدیلی مجھے ہی محسوس ہوتی ہو، کیونکہ آپا ان دنوں مجھے زہر دکھائی دیتی تھیں۔ بات بات پر رفیق، ہر وقت اسی کا نام۔ جب وہ آجاتا تو گویا آپ کی جان میں جان آجاتی۔ ایسی

گرویدہ ہوتیں کہ کسی تیسرے کا خیال نہ رہتا۔ رفیق بہت شرماتا۔ باتیں کرتے کرتے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے رکھتا۔ گویا شکایت کرتا کہ دیکھ لو۔

آپا سے میں بے حد محبّت کرتی تھی۔ ہم بہن بھائیوں میں وہ سب سے بڑی تھیں۔ مجھ میں اور ان میں کوئی چھ سال کا فرق ہو گا۔ ویسے بھی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔ مگر جب وہ رفیق کا ذکر کرتیں یا اس سے باتیں کرتیں تو میں دیوانی سی ہو جاتی۔ بہتیرا دل کو سمجھاتی کہ یہ اسے کہیں لے کر بھاگنے سے تو رہیں۔ کچھ دنوں کے لیے آئی ہیں پھر چلی جائیں گی۔ اور پھر رفیق کونسا میرا ہو گیا تھا۔ فقط یہی تھا کہ مجھے اس سے دلچسپی تھی اور جیسا کہ اس کی باتیں ظاہر کرتی تھیں، اسے بھی مجھ سے کچھ نہ کچھ انس ضرور تھا۔ نہ تو کبھی اس نے اظہار کیا اور نہ میں نے۔ بس اتنی بات پر ہر وقت چڑنا اور اس قدر حسد!

سارا قصور آپا کا تھوڑا ہی تھا۔ وہ بھی کمال کا بھولا تھا۔ آخر ہر روز یوں بن ٹھن کر کیوں آتا تھا؟ ایک روز آپا نے اس کی ٹائی پکڑ کر کھینچ لی اور مُسکرا کر بولیں۔ شریر کہیں کے ہر روز گلابی رنگ کی ٹائی لگا کر آتے ہو۔ جانتے ہو نا کہ میرے پاس گلابی رنگ کی ایسی پھولوں والی کوئی ساڑھی نہیں ہے۔ میں جل ہی تو گئی۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ جیسی ساڑھی آپا کی ہوتی ہو، ویسی ٹائی رفیق کی ہونی چاہیے!

سبحان اللہ! کیا نرالی منطق ہے! اور رفیق بھی بس موم کی ناک تھا۔ اگلے روز سے اس نے وہ ٹائی لگانی چھوڑ دی۔ یہ مرد ایورسٹ پر چڑھ جائیں، سمندر کی تہہ تک پہنچ جائیں۔ خواہ کیسا ہی ناممکن کام کیوں نہ کر لیں مگر عورت کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ بعض اوقات ایک احمقانہ حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ اچھی بھلی محبّت نفرت میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور پھر عورت کا دل ایک ٹھیس لگی اور بس گیا۔ جانتے ہیں کہ حسد اور رشک تو عورت کی سرشت میں ہے۔ اپنی طرف سے بڑے چالاک بنتے ہیں مگر مرد کے دل کو عورت ایک ہی نظر میں بھانپ جاتی ہے۔ اور پھر رفیق جیسا پگلا تو کوئی بھی نہ ہو گا۔ میں نے ہزار بار اشارتاً ذکر کیا۔ کئی مرتبہ تو صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ چونچلے نہیں بھاتے مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی۔

ایک بہت اچھی فلم آ رہی تھی۔ بھیّا نے پروگرام بنایا کہ شام کو فلم دیکھی جائے۔ رفیق کو بھی بلایا۔ دوپہر کا وقت ہو گا کہ آپ میرے کمرے میں دوڑی دوڑی آئیں۔ ”تیرے پاس کوئی کالی ساڑھی ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اس رنگ کا کیا؟“ میں نے وارڈروب میں رکھی ہوئی ایک گہرے چاکلیٹ رنگ کی ساڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں نہیں! ایسی نہیں! بالکل سیاہ! جیسے میرے بال ہیں۔ جیسا ڈنر سوٹ ہوتا ہے۔“ ڈنر سوٹ کا ذکر۔ میں اس نرالی تشبیہ پر حیران رہ گئی۔ آخر تھوڑی دیر کی اُلٹ پلٹ کے بعد ایک سلک کی سیاہ ساڑھی نکال دی۔

”اور بلاؤز۔“

”وہ بھی سیاہ رنگ کا؟“ میں نے پوچھا۔

میں نے بلاؤز بھی نکال دیا۔ ان کی باچھیں کھل گئیں۔

”بس ٹھیک ہے، سیاہ جوتے تو میرے پاس ہیں۔“ وہ بھاگ کر کمرے سے نکل گئیں۔

شام ہوئی۔ میں نے ایک سادہ سی سفید ساڑھی پہن لی۔ آپا اپنے کمرے سے نکلیں۔ سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس، سفید چہرہ کالے لباس میں چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

”آہا آپا! آج کتنی پیاری معلوم ہو رہی ہیں، چشمِ بد دور۔“

"چل جھوٹی کہیں کی۔ دیکھ تو سہی! اِدھر آ بھلا۔" وہ مجھے پڑ کر آئینے کے سامنے لے گئیں۔ "لے دیکھ تو اس سادی ساڑی میں بھی مجھ سے ہزار درجہ اچھی ہے۔" وہ بولیں۔

"خاک اچھی ہوں۔ آپ تو مجھے بنا رہی ہیں بس، بھلا کہاں میں اور کہاں آپ؟"

ساتھ کے کمرے سے بھیّا کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ "میں تو عاجز آگیا اس سے۔ یہ رفیق بھی عجیب لڑکا ہے۔ دیکھو تو سہی اب تک نہیں پہنچا۔"

"کیا اب تک نہیں آیا وہ باؤلا؟" آپا نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ یہ الفاظ کچھ چبھتے ہوئے سے محسوس ہوئے۔ آخر آپا اسے باؤلا کہنے والی کون ہوتی ہیں؟

"میں نے آج تک ایسا لڑکا نہیں دیکھا۔" آپا بولیں۔

"اب کب تک انتظار کریں گے۔ چلیے آپا، وہ خود ہی سینما پہنچ جائے گا۔" بھیّا نے کہا۔ ہم نے گھڑی دیکھی۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا تھا۔ اگرچہ آپا مُصر تھیں کہ رفیق کا انتظار کیا جائے مگر بھیّا نہ مانے۔

ہم سب کار میں جا بیٹھے۔ بھیّا نے مجھے آگے بٹھا لیا اور ننھا اور آپا پیچھے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ یکا یک بھیّا نے زور سے آواز دی۔ ”رفیق! اِدھر آؤ، ذرا جلدی کرو۔“

”ننھے تو آگے بیٹھ جا۔“ آپا نے کہا۔ ”اِدھر آجاؤ رفیق!“

میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ رفیق سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بالکل سیاہ رنگ کا کوٹ، ویسی ہی بو، ویسا ہی جوتا۔ بھیّا نے ننھے کو آگے بٹھا لیا اور وہ پیچھے جا بیٹھا، مجھے آگ لگ گئی۔ اب میں سمجھی کہ آپ نے سیاہ ساڑھی کیوں پہنی تھی اور رفیق کتنا مکّار نکلا۔ آج تک ہمارے ہاں کبھی سیاہ سوٹ پہن کر نہیں آیا۔ ضرور آپا نے فرمائش کی ہو گی۔ میں نے دوبارہ رفیق کی طرف دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں وہ آنکھوں میں کھُبا جا رہا تھا۔ سینما پہنچے۔ آپا نے سِرے کی سیٹ پر رفیق کو بٹھایا اور خود ساتھ بیٹھ گئیں۔ ان کے برابر ننھا بیٹھ گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے ایک سیٹ چھوڑ دی بھیّا کے لیے۔ ”آپ! اتنی دُور؟“ رفیق بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے پتہ نہیں کہ کیا فلم تھی، بھیّا کیا کہہ رہے تھے اور آپا کیا کہہ رہی تھیں۔ کچھ عجیب مدھم سی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے چند بے ڈھنگے سے دھبے ناچ

رہے تھے۔ میں پھنک رہی تھی۔ فقط میرے آنسو نہیں نکلے، باقی میرے رونے میں کوئی کسر نہیں رہی۔ آپا اور رفیق ہنس ہنس کر مجھے مار ڈالتے تھے۔ فلم ختم ہو گئی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ بھیّا نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ "چلو! ارے یہ کیا اونگھ رہی ہو تم؟" میں اٹھ کھڑی ہو گئی۔

بھیّا اور آپا پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"اب تو میں کار چلاؤں گا!" رفیق نے میرے برابر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ پیچھے بیٹھئے!" میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" وہ حیران رہ گیا۔

"بس یونہی!۔۔۔ آپ وہاں بیٹھے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

"آپ وہاں بیٹھئے، آپا کے ساتھ!" میں نے مُنہ پھیر لیا۔

وہ اور آپا پیچھے بیٹھ گئے۔ راستے میں وہ فلم پر تنقید کرتے رہے مگر میں چپ تھی۔ شاید اگر بولنے کی کوشش کرتی تو کبھی نہ بول سکتی۔ میں ساری رات روتی رہی۔

کتنے مکار ہوتے ہیں یہ مرد، ان کے نزدیک ایک دل کی کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔۔۔روروکر میں نے اپنا تکیہ بھگو دیا۔

آخر صبح ہو گئی اور میری زندگی کا سب سے منحوس دن طلوع ہوا، جس روز میں نے اپناسب کچھ گنوادیا۔

بھیّا کالج میں تھے۔ آپا کسی سہیلی کے ہاں چلی گئیں۔ امّی اُوپر تھیں اور ننھا میرے پاس تھا۔ دروازہ کھلا اور رفیق اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ تھا کہ کسی حد تک ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کچھ ٹھٹھکا، بالکل اسی طرح جس طرح وہ بھیّا کی علالت والی رات کو شرماسا گیا تھا۔

"ذرااِدھر آیئے، مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

"کیا ہے؟"

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے!"

"آپ کو جو کچھ کہنا ہے، یہیں کہہ دیجیے!" میں نے غصے سے کہا۔

"تو آپ نہیں سنیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"کہہ جو رہی ہوں کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ دیجیے!"

"اچھا۔۔۔ آپ کو میری باتیں ناگوار لگتی ہیں!"

"ناگوار لگتی ہیں۔ ناگوار لگتی ہیں!" میں نے چِلّا کر کہا۔ "بھلا مجھے کسی کی باتیں کیوں ناگوار معلوم ہوں، کوئی کچھ کہے، مجھے کیا؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ گویا سوچا تھا کہ اب کیا کہوں۔

"میں آپ کو ہمیشہ غلط سمجھتا رہا۔"

"مگر میں نے تو کبھی ایسا اشارہ نہیں کیا جس سے آپ کو غلط فہمی ہوتی۔"

"واقعی آپ نے کوئی اشارہ نہیں کیا مگر یہ میری حماقت تھی جو میں نے یوں سمجھا اور اب تک سمجھتا رہا۔ میں اب آپ کو کبھی تکلیف نہ دوں گا۔"

"آپ کی مرضی۔۔۔ میں نے کب آپ سے التجا کی تھی۔" اس نے عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا ہو کہ مجھے تم سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ اس کے چہرے پر کرب تھا، بے چینی تھی۔

"بہت اچھا۔۔۔ آپ نے وقت سے پہلے بتا دیا کہ آپ کی نظروں میں میری کیا وقعت ہے۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا۔ اب جب سب کچھ ظاہر ہو گیا ہے۔ ایک بات اور بتا دوں۔ وہ یہ کہ اس سے پہلے بھی اسی قسم کے حالات میں مجھے ٹھکرایا جا چکا ہے۔ مجھے ٹھکرانے والی آپ کوئی پہلی ہستی نہیں ہیں۔ خدا حافظ۔"

اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کے لبوں پر ایک بھیانک سی مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میں نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ وہ چل دیا، سر جھکائے ہوئے۔ اس نے پردہ اٹھایا اور بغیر میری طرف دیکھے کمرے سے باہر نکل گیا۔ پردہ ہل رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری قسمت پر ہمیشہ کے لیے پردہ پڑ گیا ہو۔ جی میں آیا کہ اسے آواز دے کر بلا لوں، مگر میری زبان نہ ہل سکی۔ حلق خشک ہو گیا۔ میں کوچ پر گر پڑی۔ جی چاہتا تھا کہ خوب پھوٹ پھوٹ کر روؤں چلاؤں، مگر باوجود انتہائی کوشش کے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ آپا دوسرے ہفتے واپس چلی گئیں۔ اتنے دن ہو گئے اس واقعے کو، مگر پھر کبھی رفیق ہمارے ہاں نہیں آیا۔ خدا جانے بھیّا سے کیا بہانہ کیا ہو گا۔ پھر ایک دن سُنا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ نہ اس کا کوئی خط آیا نہ کوئی خبر۔

میرے دل میں ایک پچھتاوا رہ گیا اور ساری عمر رہے گا۔ کاش کہ میں اس کی بات سُن لیتی جسے سُنانے وہ کے لیے وہ اتنا بے تاب تھا۔ خُدا جانے وہ اس روز محبّت کا پیغام لے کر آیا تھا یا میری غلط فہمی دُور کرنا چاہتا تھا۔

پھر سال کے اندر اندر ہی آپا کی ہمارے ایک رشتہ دار سے شادی ہو گئی۔

میں سوچا کرتی ہوں کہ میرے اس المیے کا باعث میری کمزوری تھی یا بڑی آپا؟ اس معمّے کو آج تک حل نہ کر سکی، مگر اس کا وہ فقرہ کہ "مجھے ٹھکرانے والی آپ پہلی ہستی نہیں ہیں۔" مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔

دو تارے

میں نے دونوں بازو اُوپر اٹھائے، پنجوں پر اچھلا اور سر کے بل چھلانگ لگا دی۔ خُنک ہوا کے جھونکوں میں سے گزرتا ہوا دھم سے ٹھنڈے پانی میں کودا۔ میری انگلیاں ندی کی تہہ سے جا لگیں۔ پھر اُچھلا اور پانی کی سطح پر آ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ گلدستے کا کوئی پتا نہ تھا۔ پانی کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ میں پورے زور سے تیرنے لگا۔ ذرا سی دیر کے بعد میں نے گلدستے کو دیکھ لیا جو کافی دور تھا۔ میں پتھروں سے بچتا ہوا بڑی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا۔ خوب لمبا سانس لے کر ایک غوطہ لگایا اور پھولوں کے بالکل پاس جا پہنچا۔ یکایک پانی گرنے کا شور سنائی دیا۔ پھوار کے بادل اٹھتے نظر آئے۔ آبشار نزدیک آ گئی تھی۔ میں نے بے تحاشا تیرنا شروع کر دیا۔ اگر فوراً ہی گلدستہ نہ پکڑ لیا تو آبشار میں پھولوں کی پتّی پتّی بکھر جائے گی۔ آخر ایک اور غوطے کے بعد میں نے گلدستے کو جا لیا اور شپ سے پکڑ لیا۔ بڑی حفاظت سے اسے کنارے تک لے آیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ میں کتنی دور چلا آیا تھا۔ ندی کے موڑ اور چیڑ کے درختوں نے اس چٹان کو چھپا دیا تھا جہاں سے چھلانگ لگائی تھی۔

گول گول پتھروں کو پھلانگتا ہوا کنارے کے ساتھ ساتھ واپس جا رہا تھا۔ وہ چٹان بھی نظر آ گئی۔ حیران ہو گیا کہ اتنی بلندی سے کسی طرح کود گیا تھا۔ دوبارہ کوشش بھی کروں تو ہمّت نہ پڑے۔

پھر اس چٹان پر ایک سفید سا دھبّہ بھی نظر آنے لگا جو بڑا ہوتا گیا۔ یہ پروین تھی۔ میں نے پھولوں کو پھر سے چُنا۔ بھلا ایسے پھولوں کو کیونکر ضائع ہونے دیتا۔ مُسکراتے ہوئے رنگ برنگے معطّر پھول، کتنے پیارے۔ بالکل پروین کی طرح!

چھوٹی پگڈنڈی کئی چکر لگا کر پہاڑ پر چڑھتی تھی، لیکن اتنی دیر کون لگاتا۔ میں سیدھا چل دیا۔ لہلہاتے ہوئے سبزے کو روندتا، خود رو پھولدار پودوں اور جھاڑیوں کو پھلانگتا اُوپر چڑھ رہا تھا۔ اب پروین اچھی طرح نظر آ رہی تھی۔ پہاڑوں کا چمکیلا سورج ابھی ابھی جنگلوں سے طلوع ہوا تھا۔ سرد ہوائیں عجیب سی خوشبو پھیلا رہی تھیں۔ نیلا نیلا آسمان، اُجلے اُجلے بادل، لہراتی ہوئی روشنیاں اور چٹان پر کھڑی ہوئی پروین، سنہرے بالوں اور گلابی چہرے والی۔۔۔ جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں سے کھیل رہی تھیں۔

اور جب میں اس کے پاس گیا تو وہ مُسکرائی۔ میں نے گلدستہ اسے واپس دے دیا۔

ایسا عجیب اتفاق ہوا۔ صبح میں تیرنے کے لیے آیا اور پروین پھول چُنتی ہوئی مل گئی۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ پھر اس نے کہا کہ میں نے یونہی چند پھولوں کے لیے اتنی بلندی سے چھلانگ لگا دی۔ میں نے جواب دیا کہ جب تیرتے ہیں تو چھلانگیں بھی لگاتے ہیں۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

میں نے ڈریسنگ گاؤن کی جیب سے سگریٹ نکالا، پوچھا۔ ”سگریٹ سلگا لوں؟“

وہ بولی۔ ”ہاں۔“

”سگریٹ پی لوں؟“

”ہاں!“ پھر خاموشی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ باتیں کرے۔

"یہ وادی کس قدر خوبصورت ہے۔ اُودے اُودے پہاڑوں کی قطاریں یوں لگ رہی ہیں جیسے سمندر کی لہریں ہوں اور جھلمل جھلمل کرتے ہوئے چشمے جیسے چاندی کے تار، ان سفید سفید بادلوں نے آسمان میں کیسے عجیب گنبد بنا رکھے ہیں۔ دیکھنا؟"

"جی!" وہ بولی۔

اب ہم ایک موڑ سے گزر رہے تھے۔

"بلندی پر یہ آبشار تو دیکھی ہی نہیں تم نے۔ کیسی دُھندلی سی قوسِ قزح نے اسے محیط کر رکھا ہے۔ چاروں طرف پھوار پڑ رہی ہے۔ یہ پانی ان چمکیلی چوٹیوں سے آ رہا ہے، وہ اُجلی اُجلی چوٹیاں، جن پر برف جمی رہتی ہے۔ کبھی تم نے یہ پانی چکھا؟ ایسا ٹھنڈا اور شیریں ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں۔ اگر تم کہو تو کل وہاں چلیں؟"

"اچھا!"

اب ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ان کی کوٹھی پہلے آتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس مختصر سے وقفے میں بہت سی باتیں ہوں۔

"خوب! ہم تو گھر کے نزدیک پہنچ گئے۔ وہ سامنے صنوبر کا اونچا درخت نظر آ رہا ہے۔ آج کیا پروگرام ہے؟ دوپہر کے بعد سب سیر کو چلیں گے نا؟ نہیں؟ ابّا دو بندوقیں لائے ہیں۔ ایک میں لے چلوں گا۔ پرندوں کا شکار کریں گے۔ جو اس جھنڈ کے پیچھے جھیل ہے وہاں چلیں گے۔ وہاں ناشپاتیاں بھی ہیں اور سیب بھی، شاید اسٹرابری بھی ہو۔ تم کلیوں اور جنگلی پھولوں کے گلدستے بنانا، میں تیار رہوں گا کہ کب وہ تمہارے ہاتھ سے گر کر نیچے بہتے ہوئے نالے میں جا پڑیں اور میں دھم سے چھلانگ لگا دوں۔"

"لیکن آج دوپہر کے بعد تو۔۔۔ آج ذرا وہ۔۔۔ مجھے کچھ پڑھنا تھا۔"

اب ان کا گھر آ گیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ "اچھا لائیے جناب ہمارا گلدستہ واپس کر دیجیے۔" اور پھول واپس لے لیے۔

وہ چلی گئی۔ میں کھڑا دیکھتا رہا۔

پھر ایک سرد شام کو میں لمبی سیر سے واپس آ رہا تھا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ سے بالکل تھکا ہوا۔ گلے میں کیمرہ، بندوق، تھیلے اور نہ جانے کیا کیا الا بلا۔ گھر اب

نزدیک تھا۔ صرف دو موڑ اور رہ گئے تھے۔ یکایک میری نگاہ چیڑ کے درخت کی چوٹی پر گئی جہاں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ لمبے لمبے نوکدار پتوں میں سے ایک بڑا چمکیلا تارا جھانک رہا تھا۔ میں وہیں رک گیا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر چکر کاٹ کر اور اُوپر پہنچا۔ ہوا کے جھونکے تیز ہو گئے اور خنکی بڑھ گئی۔ موڑ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک اور تارا بھی چمک رہا تھا اتنا بڑا اتنا ہی پیارا۔۔۔

پہلے تارے کے بالکل قریب۔

میں مُسکراتا ہوا ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان دو تاروں کو دیکھنے لگا۔ وسیع آسمان میں جہاں لاتعداد ننھے ننھے تارے چمک رہے تھے وہاں یہ دونوں روشن ستارے سب کو خیرہ کیے دیتے تھے۔ ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ، جیسے ہاتھ پکڑے ہوئے ہوں اور فضا کی ظلمت میں دوش بدوش چل رہے ہوں۔

کتنی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ سوچا کہ یہ تارے ضرور پروین کو دکھاؤں گا۔ اور جب گھر پہنچا تو عجیب خبط مجھ پر سوار ہو گیا۔ ساری رات نہ سو سکا۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد اٹھتا اور باہر نکل کر دونوں تاروں کو دیکھتا کہ دونوں ساتھ ہی ہیں، کہیں بچھڑ تو نہیں گئے، مگر وہ رات بھر ساتھ رہے۔ جب پچھلے پہر دُھندلے ہوئے تب بھی اکٹھے اور ساتھ ہی غائب ہو گئے۔

اگلی شام کو جب ہم سب سیر سے واپس آ رہے تھے تو میں نے پروین کو باتوں میں لگا لیا اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اسی موڑ پر پہنچے جہاں سڑک کے ایک طرف تو اونچا پہاڑ تھا اور دوسری طرف وادی تھی۔

نیچے کہیں اِکی دُکی روشنی ٹمٹما جاتی اور پھر اندھیرا ہو جاتا۔ نیا چاند آسمان میں تیر رہا تھا۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی، بالکل پھیکی سی۔

جہاں دوسرے تاروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی وہاں یہ دونوں تارے بالکل اسی طرح چمک رہے تھے بلکہ چاند سے بھی زیادہ روشن تھے۔

"وہ تارے دیکھ رہی ہو؟" میں نے اشارہ کر کے کہا۔

وہ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے انہیں دیکھنے لگی۔ میں اس کے جگمگاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ساتھ ساتھ ہیں۔" میں نے کہا۔

"اور رات بھر میں انہیں دیکھتا رہا۔ یہ یونہی اکٹھے سفر کرتے رہے اور غروب بھی اکٹھے ہوئے۔ مجھے یہ ڈر رہا کہ کہیں بچھڑ نہ جائیں۔"

اور جب اس نے بڑی بڑی مسحور کن آنکھوں سے مجھے دیکھا تو میں بے چین ہو گیا۔ نہ جانے ان نگاہوں میں کیا پیغام تھا؟ اور وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ اس ملگجے دوپٹے کے حاشیے میں وہ گلابی چہرہ ایک خوابیدہ پھول دکھائی دے رہا تھا، جو ہوا کے جھونکوں سے ابھی ابھی کھلا ہو۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ ایک رنگین اور سہانا خواب ہے۔ آسمان پر دمکتے ہوئے تارے یونہی نہیں جھلملاتے۔ ان کے بھی اشارے ہیں۔ رمزیں ہیں۔ شبنم گُل سے چپکے چپکے کیا کہہ جاتی ہے؟ چاند سمندر کی لہروں سے رات بھر کیا باتیں کرتا رہتا ہے؟ کنول کے پھول ہوا سے کیا سرگوشیاں کرتے ہیں؟ یہ ایک راز ہے۔

جب ہم واپس آرہے تھے تو میں انہی تاروں کا ذکر کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”کہتے ہیں کہ ان تاروں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ وہ سرد مہری سے بولی۔ ”ہوتا ہوگا۔“

وہ یکلخت گھبرا گئی، جیسے کوئی خواب دیکھتے دیکھتے ڈر جائے۔ اس نے پھر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ راستے میں بہت کم باتیں ہوئیں۔ دیر تک سوچتا رہا کہ اس فوری تبدیلی کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

ہمیں پکچر دیکھے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ پندرہ بیس میل دور نیچے ایک سینما تھا۔ پہلے ایک مرتبہ وہاں جاچکے تھے۔ طے ہوا کہ پکچر دیکھی جائے۔ بزرگ حضرات میں سے چند ایک نے اختلاف کیا، بعد میں وہ بھی مان گئے۔

کار میں، میں آگے بیٹھا تھا اور پروین پچھلی سیٹ پر۔ جب ہم ایک اندھیرے جھنڈ میں سے گزر رہے تھے تو میں نے سامنے لگا ہوا شیشہ ترچھا کر دیا۔ اب میں پروین کو دیکھ سکتا تھا اور وہ مجھے۔ پتہ نہیں کار میں کیا باتیں ہوتی رہیں؟ بس میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ مجھے۔ لیکن دیکھتے دیکھتے نہ جانے وہ کیوں چونک پڑتی اور جو نگاہیں نیچی کرتی تو میں تنگ آجاتا۔ یہ معمّہ بالکل سمجھ میں نہ آیا۔ نیچے پہنچے، وہاں ایک رنگ برنگا طویل کارٹون دکھایا جارہا تھا۔

اس میں سنو وائٹ ایک بڑی پیاری لڑکی تھی اور سات چھوٹے چھوٹے مسخرے بونے تھے۔ پروین میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ خوب مُسکرا رہی تھی۔

میں نے آپا کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بولیں ”چپ!“

دوبارہ کہا۔ وہ بولیں۔ ”ہشت!“

پروین سے کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ”کہہ دوں؟“

بولی۔ ”کہہ دیجئے!“

میں نے زور سے کہا۔ ”ایک سنو وائٹ ہمارے ساتھ بھی ہے!“

سب پوچھنے لگے۔ ”کون؟“

میں نے پروین کی طرف اشارہ کر دیا۔ ایک قہقہہ پڑا اور شرما گئی۔

”کس طرح بھلا؟“ کسی نے پوچھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ”شکل و صورت بالکل ملتی جلتی ہے۔ بھولی بھالی۔۔۔

اور؟“

آپا نے مجھے بری طرح گھورا۔

جب ہم واپس آنے لگے تو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ پروین کے ساتھ ایک ننھی منی سی بچّی بیٹھی تھی۔ اس کے ریشم جیسے بالوں سے بڑی اچھی سی خوشبو آ رہی تھی اور ایک نیلا ربن لہرا رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان میں گڑیا بیٹھی تھی۔

ننھی ٹکٹکی باندھے پروین کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے اس کے ایک کان میں پوچھا۔

"دیکھ رہی ہوں کہ آپا کتنی پیاری ہیں۔" وہ بولی اور میں نے اس کے ننھے ہونٹ چوم لیے۔

سامنے بھاگتی ہوئی ٹہنیوں اور پتوں میں وہی دو چمکیلے تارے جھانک رہے تھے۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، لیکن دونوں اسی طرح دمک رہے تھے۔

"وہ دیکھو دو تارے!"

پروین ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

"وہ بائیں طرف کا تارا تمہارا ہے اور دائیاں میرا۔" میں نے کہا۔ وہ میری بائیں طرف بیٹھی تھی۔

"جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

کار کو گیراج میں چھوڑ کر ہم دونوں ان کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ سہانی چاندنی کھِلی ہوئی تھی۔ ہم گلاب کے تختوں سے گزرے جہاں پھول، کلیاں، پتّے سب سوئے پڑے تھے۔ پھر لمبے لمبے سایوں اور پھولوں سے لدی ہوئی بیلوں میں سے گزرتے ہمیں ننھی ننھی کلیوں نے چھپ چھپ کر دیکھا۔

تاروں کے جھرمٹ نے ہمیں اکٹھے چلتے دیکھا۔ چاند جو اونچے درختوں میں سے جھانک رہا تھا ہمیں دیکھ کر مُسکرانے لگا اور چاندی کئی گنا تیز ہو گئی۔

میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"وہ یہ ہے کہ میں ایک عرصے سے چاہتا تھا کہ کہہ دوں؟"

"کہہ دیجیے۔"

"اور پھر کہہ دینا ہوتا بھی اچھا ہے، بھلا چھپانے سے کیا فائدہ؟ بات دراصل یہ ہے۔۔۔ کہ وہ۔۔۔!"

"ہاں ہاں کہیے!" وہ مُسکرانے لگی۔ میں گھبرا گیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ مدّت سے کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔"

"ہاں۔"

"یہی کہ۔۔۔ یہی کہ یہ تارے بہت چمکتے ہیں۔ اور پھر تارے بھی خدا نے خوب بنائے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو رات کو بڑا اندھیرا رہا کرے۔"

اب ان کی کوٹھی بالکل نزدیک آگئی تھی۔ میں نے پھر ہمّت کی۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے، جو کچھ کہنا ہے، اب بھی کہہ دو۔ کیا بزدلی دکھا رہے ہو۔ میں نے گلا صاف کیا اور بولا۔

"نہیں تاروں کی بات نہیں ہے۔ بات کچھ اور ہے، مجھے ڈر تھا کہیں تم برا نہ مان جاؤ۔ لیکن اب کوئی ڈر نہیں، تمہیں برا لگتا ہے تو لگا کرے۔ میں ضرور کہوں گا!"

"ہاں ہاں کہہ دیجیے۔" وہ مُسکرا رہی تھی۔

”یہی کہ مجھے اتنے دونوں سے تم سے۔۔۔یعنی مجھے سچ مچ تم سے یونہی۔“

”ہاں۔“

”مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔ یہی کہ تم اتنے سادے لباس کیوں پہنتی ہو جبکہ تمہارے پاس ایسے اچھے لباس ہیں۔“

وہ ہنس دی۔ اب ہم بر آمدے میں پہنچ گئے تھے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہر گز اسے نہیں بتا سکتا۔

کیا تو وہ مُسکرا رہی تھی اور کیا بے چین ہو گئی۔

وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میں ہکّا بکّا کھڑا ہو گیا۔ یہ کیا اسرار ہے؟ اس رویے میں کیا راز پوشیدہ ہے جسے میں سمجھ نہیں سکتا۔ آخر یہ بے رخی کیا ظاہر کرتی ہے؟ میرے ساتھ یہ دفعتہً رنجیدہ کیوں ہو جاتی ہے؟ کس قدر پیچیدہ ہے یہ معمّہ؟

اور یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا، ہر دفعہ یہی ہوتا ہے۔ مُسکراتے ہوئے چہرے پر یکلخت خوف کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ کہیں اسے مجھ سے نفرت تو نہیں؟

نہیں نہیں نفرت نہیں ہو سکتی۔ اگر ہوتی تو یہ بتا دیتی مگر بتاتی کس طرح؟ کیونکر کہہ دے کہ مجھے آپ اچھے نہیں لگتے، مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ شاید یہ مجھے صرف ایک رفیق سمجھتی ہے، ایک مخلص رفیق۔۔۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اپنی محبّت کے قابل نہیں سمجھتی۔ میں ساری رات یہی سوچتا رہا۔ کئی بار اُٹھ اُٹھ کر میں نے تاروں کو دیکھا کہ کہیں بچھڑ تو نہیں گئے مگر وہ بدستور اکٹھے تھے۔ دل کو اطمینان سا ہو گیا۔

دوسرے روز دیکھا کہ سامنے کی کوٹھی میں کچھ مزدور کام کر رہے تھی۔ چٹان پر چڑھ کر دیکھا تو ٹینس کا میدان ٹھیک کیا جا رہا تھا۔ لائنیں لگائی جا رہی تھیں۔ میری رال ٹپک پڑی۔ مدّت سے ٹینس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ جی میں آیا ان لوگوں سے واقفیت پیدا کی جائے۔ ہماری اور ان کی کوٹھی کے درمیان ایک چھوٹا سا نالا بہتا تھا جس میں میں روز نہایا کرتا تھا۔ اس کا پُل آدھ میل پرے تھا۔ نوکروں نے بتایا کہ سامنے کوئی انگریز کُنبہ آیا ہے۔ ان کی ایک لڑکی ہر روز تیرنے آتی ہے۔ مجھے یاد آ گیا۔ ایک انگریز لڑکی کو کبھی کبھی نالے کے دوسرے کنارے پر دیکھا تھا، لیکن باتیں کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

چند دنوں تک ہماری واقفیت ہو گئی۔ اس نے میرے تیرنے کی تعریف کی اور میں نے اس کی چستی اور لباس کی۔ ہم صبح اکٹھے تیرتے، پہاڑ پر چڑھتے۔

وہ کہا کرتی، آپ بہت اچھا تیرتے ہیں۔ آپ کا جسم کتنا موزوں ہے، بالکل سپورٹس مین جیسا۔ کبھی ہمارے ہاں بھی آیئے۔ ممی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ میں عموماً ان سے آپ کا ذکر کیا کرتی ہوں۔ ہم لوگ تنہائی سے تنگ آ جاتے ہیں۔ اب باہر گئے ہوئے ہیں۔ ممی کسی سہیلی سے ملنے کئی میل دُور چلی جاتی ہیں۔ میں اکیلی گھبراتی ہوں۔ ہمارے ہاں پنگ پانگ بھی ہے اور ٹینس بھی۔ میں مووی کیمرے سے تصویر اُتارا کرتی ہوں۔ ہمارے ہاں رنگ برنگے خوبصورت پرندوں سے پنجرے بھرے ہوئے ہیں۔

لیکن میں ٹال مٹول کر جاتا۔

ایک دن پروگرام بنا کہ دوپہر کو میرے تیرنے کی فلم اتاری جائے۔ وہ اپنا مووی کیمرہ ساتھ لائی۔ میں نے ایک اونچے پتھر سے چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

"مجھے آپ اس پتھر پر لے چلیے!" وہ ایک پتھر کی طرف اشارہ کر کے بولی جو نالے کے وسط میں تھا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ میں جھجک کر پیچھے ہٹ گیا لیکن پھر رُکتا ہوا آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لطیف بوجھ کو سنبھال لیا۔ اس نے ایک بازو میری گردن پر ڈال لیا اور دوسرے سے پانی کے چھینٹے اڑانے لگی۔

"نہیں یہ پتھر تو اچھا نہیں۔ وہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے ایک دُور کے پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں روشنی بھی تیز نہیں ہے۔ اور وہاں سے تصویر بھی اچھی آئے گی۔"

میں نے رُخ بدل دیا اور ادھر چلنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ سرگوشیوں میں بولی۔

"مجھے ایسے لڑکے بہت اچھے لگتے ہیں، آپ جیسے بے پروا اور خوش باش۔ لیکن اتنی بے پرواہی بھی کس کام کی۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، لیکن میں تیزی سے پتھر تک پہنچا اور جلدی سے اسے اتار دیا۔ وہ خاموش ہو گئی، لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور مُسکرانے لگی۔ اس کے بعد دیر تک فلم اترتی رہی۔

ایک صبح کو میں سیر سے واپس آ رہا تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ پروین پھولوں کا گلدستہ بنا رہی تھی اور ننھی ساتھ بیٹھی تھی۔ جی میں آیا کہ ان کی باتیں سنوں۔ آخر کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ میں دبے پاؤں پودوں کی آڑ میں بالکل ان کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔

ننھی بولی۔: ”تو اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں گی نا؟“

”ہمیشہ تو رہتی ہوں تمہارے ساتھ ننھی گڑیا!“

”اُوں ہوں۔ میں پوچھتی ہوں آپ ہمارے ساتھ چلیں گی۔ ہماری آپا بن کر؟“

پروین کا دمکتا ہوا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

”بتاؤنا آپا!“ ننھی مچلنے لگی۔

”دیکھو نزہت کیسی رنگ برنگی کلیاں ہیں۔“ پروین بولی۔

”نہیں ہمیں کلیاں نہیں چاہئیں۔ آپ بتایئے کہ چلیں گی ہمارے ساتھ یا نہیں؟“

”ارے یہ دیکھو کیسی اچھی تتلی اڑی جا رہی ہے، پکڑ لو تو جانیں۔“

اور جب ننھی بیٹھی رہی تو پروین خود تتلی کے پیچھے بھاگ پڑی۔

شام کو سیر سے واپس آتے ہوئے مجھے موقع مل گیا اور میں نے پروین کو اپنے ساتھ ٹھہرالیا۔ ”آؤ جھیل تک چلیں۔“ میں نے کہا۔

”دیر تو نہ ہو جائے گی؟“

”نہیں!“

ہم دونوں ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔

اُودے اُودے پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے درختوں کی قطاریُوں چمک رہی تھی جیسے سنہری سنجاف لگی ہوئی ہو۔ آسمان شفق کی سرخی سے جگمگا رہا تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اُڑے جارہے تھے۔

ہم دونوں چپ چاپ چل رہے تھے۔ معطّر ہواؤں کے جھونکے تیز ہوتے گئے اور ہم دونوں موڑ تک پہنچ گئے۔ میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ دونوں تارے ابھی طلوع ہوئے تھے۔ دل مسرت سے لپکنے لگا۔ میں نے پروین کو دیکھا اور نگاہوں نگاہوں میں اتنا کچھ کہہ گیا کہ زبانی نہ کہہ سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس سے سب کچھ پوچھوں گا۔ آج اس معمّے کو حل کر کے رہوں گا۔

”تمہیں یہ تارے اچھے لگتے ہیں نا؟“ میں نے پوچھا۔

"ہاں! بہت!" وہ بولی۔

"ارے!" میں وہیں رُک گیا۔ "تارا ٹوٹا پروین!"

ان میں سے ایک تارا ٹوٹا اور نورانی لکیر بناتا ہوا غائب ہو گیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پروین کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی سہم گئی تھی۔

"کون سا تارا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"پتہ نہیں کون سا تھا!"

بہتیرا یاد کرنے کی کوشش کی مگر پتہ نہ چلا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا۔

چیڑ کے درختوں کی نوکدار چوٹیوں پر صرف ایک روشن تارا جگمگا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی چمک بھی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

جب ہم واپس آ رہے تھے تو جنگل میں سناٹا تھا۔

پھر وہ حقیر سا اندیشہ جسے میں پہلے نظر انداز کر دیا کرتا آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور مجھے نہ جانے کیوں یقین سا ہو گیا کہ پروین کو مجھ سے نفرت ہے۔ شروع ہی سے نفرت تھی اور میں ہمیشہ اسے غلط سمجھتا رہا۔

اونچے اونچے درختوں سے گھری ہوئی جھیلوں کی سطح پر میں نے اداسی دیکھی۔ درختوں کے کانپتے ہوئے سائے دیکھے۔ پتّوں کی سرسراہٹ میں سرد آہیں سنیں۔ میں نے سوچا کہ پانی کی یہ سطح میری روح کی طرح ہے جس پر تاریکیاں منعکس ہیں، جس پر دہشت ناک تاریکی چھاتی جا رہی ہے۔ میں نے تھرتھراتی ہوئی ٹہنیاں دیکھیں۔ بڑے بڑے اداس پھول دیکھے جو ڈنٹھلوں پر جھکے ہوئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا جیسے دنیا نہایت غمگین جگہ ہے۔ یہاں مسرّت کی اتنی سی رمق بھی تو نہیں۔ آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، رنج ہیں، پھیکے پھیکے خوابوں میں وحشت ہے۔ میں چڑ چڑِا ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سارے مشغلے ختم ہو گئے۔ رات کو کھڑکی میں دُور روشنیاں نظر آئیں ایک تو اسی تنہا تارے کی چمک اور دوسری روشنی انگریز لڑکی لُوسی کی کوٹھی سے آتی۔

میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔ طرح طرح کے رنگ سامنے رکھے تھے۔ دھڑام سے دروازہ کھلا اور ننھا اندر دوڑتا ہوا آیا۔ پیچھے پیچھے اور بچّے تھے۔ ہاتھ میں کرکٹ کا بلّا اور گیند تھی۔

"آہاہا، تصویر بن رہی ہے۔ کیسی رنگ برنگی تصویر ہے۔ یہ کہاں کی ہے؟"

"کہیں کی بھی ہو۔ تم جا کر کھیلو!"

"ہم تو یہ تصویر لیں گے۔ ابھی نہیں، جب یہ بن جائے گی تب۔"

"اسی وقت دوڑ جاؤ ورنہ پِٹ جاؤ گے۔"

"اچھا آپ یہ تصویر ہمیں دے دیں گے نا؟"

"نہیں! ہر گز نہیں!" میں نے غصے سے کہا۔

"اچھا تو ہمارے ساتھ کرکٹ ہی کھیل لیجئے۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ بولنگ سکھائیں گے۔"

"اس وقت نہیں! پھر کبھی سہی!!"

"آج تو ہم آپ کو ضرور لے کر جائیں گے۔"

"میں آج ہر گز نہیں کھیلوں گا!"

"اچھا اگر نہیں کھیلتے تو یہ تصویر ہی۔۔۔"

"شیطانو" میں چلا کر بولا۔ "تم نے مجھے کیا سمجھا ہے؟ میں تمہارا ڈرل ماسٹر ہوں یا لنگوٹیا دوست لو یہ رہی تصویر!" میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

دیر تک بیٹھا پیچ و تاب کھایا کیا، پھر کوٹ اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ نوکر کو آواز دی کہ موٹر سائیکل لے آئے۔ دو نوکر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ایک ہنسا اور دوسرے کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بھی دانت نکال دیئے۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو تمہیں بھی ہنسی سوجھتی ہے، صاف صاف بتاؤ کیا بات تھی؟"

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ موٹر سائیکل تو پچھلے ہفتے آپ ہی نے مرمّت کے لیے بھیجی تھی۔"

دیر تک کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ننھی کی آواز نے چونکا دیا۔ اس کا ننھا منا ساہاتھ میرے چہرے کو چھو رہا تھا۔

"بھیّا۔" میں چونک پڑا۔ "ایں"

"بھیّا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں! آیئے آپا پروین کے ہاں چلیں؟"

"نہیں! وہاں نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر مجھے اپنے ساتھ سیر کو لے چلیے۔"

"نہیں! اور کسی کے ساتھ چلی جاؤ مجھے کام ہے!"

"کوئی بھی کام نہیں آپ کو، آپ یونہی رات تک یہاں بیٹھے رہیں گے!"

"اب جاؤ! کہا مانا کرتے ہیں بڑوں کا۔"

"نہیں! ہم تو سیر کو چلیں گے اور وہ وہاں سے آپا پروین کے ہاں!" وہ مچل گئی۔

میں نے اسے جھڑک دیا۔ "ننھی شور نہ کرو۔"

وہ چپ رہی۔ اس نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ معصوم آنکھیں دُھندلی ہو گئیں اور دو بڑے بڑے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔ وہ چپکے سے باہر جانے لگی۔ میں نے دوڑ کر پکڑ لیا اور گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔

کتنی مرتبہ امّی نے بھی ٹوکا کہ یہ کیا سارا دن کمرے میں بند رہتے ہو۔ کیا تو صبح سے شام تک قہقہے لگاتے پھرتے تھے اور کیا اب ہر وقت کا بسورنا رہ گیا ہے۔

پروین کے ہاں سے ہر تیسرے چوتھے روز شکایت آتی کہ میں وہاں نہیں جاتا۔ ایک روز ابّا بولے "شاید تمہاری طبعیت ٹھیک نہیں، سامنے کے پہاڑ پر ایک انگریز ڈاکٹر رہتے ہیں انہیں دکھائیں گے۔" انہوں نے جس مکان کی طرف اشارہ کیا وہ لُوسی کا تھا۔ نالے کے اس کنارے سے دیکھا لُوسی اپنے باغیچے میں کھڑی تھی، سبز رنگ کا گاؤن پہنے۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر نہ جانے کیا دل میں آیا۔ جھٹ سے شوخ رنگ کی سبز جرسی پہنی، بال سنوارے اور سیدھا چل دیا پُل کی طرف۔ لُوسی کی کوٹھی اور ہمارے درمیان جو نالا تھا اس کا پل۔

میں نے جلدی سے پُل عبور کیا۔ لُوسی نے مجھے دیکھا دوڑی دوڑی آئی۔ اس کا چہرہ اور بھی دمکنے لگا۔ میری شوخ جرسی کو دیکھا اور بڑی تعریف کی۔ پھر میرے بازوؤں کو دیکھتی رہی۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے رکھا۔ اس کی امّی کہیں باہر

تھیں۔ مجھے کوٹھی کا کونہ کونہ دکھایا، پرندے دکھائے، پھر صوفے پر بٹھا کر اپنا البم دکھانے لگی۔ وہ میرا سہارا لیے صوفے کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس کی معطّر زلفیں میرے چہرے کو چھو رہی تھیں۔ ہم خوب قہقہے لگاتے رہے۔

جب میں لوٹا تو مسرور تھا، مطمئن تھا، سیٹی بجا ہوا آ رہا تھا۔ میں نے وہ پُل اچھلتے کودتے عبور کیا۔

اس کے بعد ہم اکٹھے سیر پر جاتے، تصویریں اتارتے۔ میرا زیادہ وقت ان کے ہاں گزرنے لگا۔ پروین جیسے غائب ہو گئی۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار آمنا سامنا ہو گیا۔ روکھا پھیکا سلام ہوا اور بس!

اب میں پھر ہنس مکھ ہو گیا تھا۔ چڑ چڑا پن جاتا رہا تھا۔

ایک دن میں اور لُوسی دونوں سیر سے واپس آ رہے تھے۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو چلا تھا۔ ہم اسی موڑ پر پہنچے۔ میری نگاہیں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں۔ چیڑ کے درختوں پر ایک تنہا تارا چمک رہا تھا۔

ہم دونوں اس پتھر پر بیٹھ گئے جہاں کبھی میں اور پروین بیٹھتے تھے۔ ان لمحات میں مَیں نے اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کیا۔ وہ کونسی سلگتی ہوئی چنگاریاں

تھیں جو بھڑک اٹھیں۔ میرا جی بھر آیا۔ لُوسی شاید کچھ کہہ رہی تھی، لیکن میں کچھ نہ سُن سکا۔ اس تنہا تارے کو دیکھتا رہا۔

دن گزرتے گئے اور آخر وہ دن آ گیا جب ہمیں واپس جانا تھا۔ ابّا کی چھُٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میرا کالج بھی کھلنے والا تھا۔ ہم سب واپس جا رہے تھے۔ میرا جی تو نہ چاہتا تھا کہ پروین کے ہاں جاؤں لیکن آپا کی خشمناک نگاہوں نے مجبور کر دیا۔ پروین کے ابّا اور امّی بے رُخی سے ملے۔ نہ انہوں نے خود خط لکھنے کا وعدہ کیا اور نہ مجھے خط لکھنے کی تاکید کی۔

پروین کی انّا اپنے وطن جا رہی تھیں۔ اسٹیشن تک اس کا اور ہمارا ساتھ تھا۔ پہلی کار میں سب جا چکے تھے۔ دوسری میں سامان تھا اور میں اور انّا۔

سب سے آخر میں پروین سے ملنے اس کے کمرے میں ڈرتے ڈرتے گیا، جیسے مجھے وہاں جانے کا کوئی حق نہ تھا۔

”خدا حافظ پروین!“ میں چپکے سے بولا۔

”خدا حافظ!“ اس نے سرد مہری سے کہا اور کھڑکی سے سفید سفید برفانی چوٹیوں کو دیکھنے لگی۔

چند لمحے ٹھہرا کہ شاید وہ کچھ کہے، لیکن وہ چپ رہی اور میں چلا آیا۔ ذرا سی دیر میں ہم واپس جا رہے تھے۔ کار فرّاٹے بھرتی جا رہی تھی۔ سامنے چیڑ کے درخت، اُودی اُودی پہاڑیاں، رنگ برنگے کنج، چمکیلی ندیاں۔۔۔ سب اُڑے جا رہے تھے۔

سوچتے سوچتے میں نے انّا سے پوچھا۔ ”ایک بات بتاؤ گی؟“

”کیا ہے؟“

”انّا تم بہت اچھی ہو۔۔۔ اب تم چلی جاؤ گی پھر نہ جانے کب تمہاری زیارت ہو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو تم؟“ وہ خفگی سے بولی۔

”یہی کہ میں کیسا ہوں؟“

”اچھے بھلے ہو!“

”تو پھر پروین کو مجھ سے نفرت کیوں تھی؟ یعنی میں اسے بُرا کیوں لگتا تھا؟“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

''تمہیں سب پتہ ہے۔ فقط یہ بتادو کہ اس نفرت کی وجہ کیا تھی؟ اتنی کوشش کے باوجود اس کے پتھر سے دل پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہی۔ آخر کیوں؟''

''سُننا ہی چاہتے ہو تو سُن لو۔ تم اسے محبّت کہتے ہو؟ یہ خود غرضی ہے یا محبّت؟ تم جیسا خود غرض تو کہیں بھی نہ ہو گا۔ تمہیں کبھی بھی اس کا خیال نہیں تھا۔''

''نہیں نہیں۔ یہ مت کہو۔''

''کیوں نہ کہوں؟ تم ذرا سی دلچسپی جتا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ تمہیں پوجنے لگے۔ تم نے اسے دیا کیا تھا جو بدلے میں اتنی توقع رکھتے تھے۔ کبھی اپنے رویّے پر بھی غور کیا؟ تم نے اسے کس قدر رنج پہنچائے ہیں؟''

میں پاگلوں کی طرح اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''آج سے دو برس پہلے ایسے ہی دن تھے۔ ہم گرمیوں میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ پروین یہاں مینا کی طرح چہکتی تھی۔ کتنی چنچل تھی، کتنی ہنس مکھ۔۔۔ سب اس کی شوخیوں سے پناہ مانگتے۔ اس کا منگیتر بھی یہیں تھا؟''

''منگیتر؟''

”ہاں! بیگم کا بھتیجا یا بھانجا۔ عجیب سا لڑکا تھا۔ ایسا باتونی کہ صبح سے شام تک بولتا رہتا۔ بچپن سے رشتہ طے ہوا تھا۔ پروین نے ہوش سنبھال کر صرف اسے ہی دیکھا تھا!“

”وہ لڑکا کیسا تھا؟ میرا مطلب ہے شکل و صورت میں؟“ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”یونہی منحنی سا تھا۔ خاص بُرا بھی نہیں تھا لیکن اس کا منگیتر تھا۔ وہ ہر وقت خوش رہتی تھی، کتنی بھولی سی تو ہے۔ پھر اس کی زندگی میں بڑا منحوس دن آیا۔۔۔ وہ لڑکا کہیں چلا گیا اور پھر کبھی نہ لوٹا۔ خبر آئی کہ اس نے کسی نہایت مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ دراصل اسے پروین کے ابّا کی جائیداد سے دلچسپی تھی۔ پروین کا خیال نہ تھا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے اس لڑکی کو کبھی خوش نہیں دیکھا۔ سدا غمگین رہتی ہے۔ مُسکراتی ہے تو ٹھنڈا سانس بھر کر۔ اس کی ہنسی میں آنسو چھپے ہیں۔ ایک شوخ تتلی کی جگہ اب سنجیدہ اور افسردہ پروین رہ گئی ہے۔ اس کے نازک دل کو اس صدمے سے ایسی ٹھیس لگی کہ وہ کبھی سنبھل نہ سکی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ سب کے سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ایک ایک کر کے سب اسے چھوڑ کر چلے جائیں گے اور یہ اکیلی رہ جائے

گی۔ یہ تمہیں کتنا اچھا سمجھتی تھی اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو۔ مجھ سے تمہاری باتیں کیا کرتی۔ تمہاری خوبیاں، تمہارے خلوص کی تعریفیں۔ جس دن تمہیں دیکھ نہ پاتی اسے چین نہ آتا۔ لیکن اسے یہی اندیشہ تھا کہ کہیں تم بھی اسے نہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چنانچہ تم نے یہی کیا۔ تم نے اس کے رہنے سہے سہارے کو بھی چھین لیا۔ وہ بیچاری ہمیشہ جھجکتی رہی۔ اسے تمہاری باتوں پر اعتبار تھا لیکن وہ جھجکتی تھی۔۔۔ اور تم ایسے خود غرض نکلے کہ اس کی ذرا پروانہ کی اور آخری دنوں میں جب تم نے اس سے بولنا چھوڑ دیا تو وہ بہت اداس رہنے لگی۔ جب تم لُوسی کی کوٹھی۔۔۔۔!"

اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ میں کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے دل کو مسوس رہا تھا۔ جب میں اس بھیانک خواب سے چونکا تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ فضا میں ماتم سا تھا۔ ہوا کے اداس جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

میرے سامنے چیڑ کے درخت پتھروں کے ڈھیر، پہاڑیاں سب اُڑے جا رہے تھے۔ کار فرّاٹے بھرتی جا رہی تھی۔

میں ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر شفق کو دیکھنے لگا۔ درختوں کے جھُنڈ پر ایک گلابی بدلی کے پاس ایک چمکیلا تارا جگمگا تا رہا تھا۔

دُھندلی دُھندلی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔۔۔ اسی تنہا تارے کو!

مَیں پھر بھی نہ سمجھ سکا کہ کون سا تارا ٹوٹا تھا!

نسرین

عید کے دن صبح صبح مقبول ملے۔ باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کلّے پر کلّا چڑھا ہوا تھا۔ مارے خوشی کے مُنہ سے بات ہی نہ نکلتی تھی۔ پوچھا کہ کہاں بندھے ہو آج کل؟ یہ اتنے گول مٹول سے کیوں ہو گئے؟ آخر کیا ارادہ ہے؟ جواب ندارد بس مُسکرا رہے ہیں۔ بے تحاشا ہنس رہے ہیں۔ آخر تنگ آ کر میں بھی ہنس پڑا اور کرنا بھی کیا۔

ہم دونوں برسوں "ہم تھپڑ اور ہم مُکّا" رہ چکے تھے۔ دسویں جماعت کے بعد یہ اچانک کہیں فرار ہو گئے۔ پھر عرصہ تک لاپتہ رہے اور اب اتنے دنوں کے بعد یکلخت مل گئے۔

مقبول پہلے سے لٹک گئے تھے۔ توند بھی طلوع ہو رہی تھی۔ چہرہ بھی دائرے کی شکل بنا رہا تھا۔ بڑے معتبر سے لگتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کہیں دُور جنگلوں میں بزنس کرتے ہیں۔ اب ہنسنے کی میری باری تھی۔ خوب ہنسا۔ تو گویا بزنس

کرتے ہیں اور جنگلوں میں۔ ہو گا کوئی درندوں کا یا چرندوں کا۔ لا حول ولا قوۃ، بھلے آدمی یہی کام رہ گیا تھا دنیا میں کیا؟

پھر کہنے لگے۔ ”میری شادی ہو رہی ہے۔“ اور میں ان سے چمٹ گیا۔ ”کس سے ہو رہی ہے؟ کب ہو رہی ہے؟ کیوں ہو رہی ہے؟“ شرما شرما کر بتایا کہ عزیزوں میں ہی ہو رہی ہے اور یہ اسے جانتے بھی ہیں۔

پوچھا ”کیسی ہیں؟“

شرما کر بولے۔ ”اچھی ہیں۔“

میں نے مچل کر کہا۔ ”یوں بات نہیں بنے گی۔ میں ان کی صحت کے بارے میں نہیں پوچھ رہا، جو کہہ دیا کہ اچھی ہیں۔ ان پر تفصیلاً روشنی ڈالو۔ اچھی طرح مکمل طور پر واضح کرو۔“

پھر انہوں نے اپنی رام کہانی سنائی کہ اسے وحشیوں اور بے وقوفوں کی طرح چاہتے تھے اور چاہتے کیا تھے خدا جانے کب سے چاہتے آ رہے تھے۔ ان کی دِلی تمنّا یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اسے رفیقۂ حیات بنائیں، چنانچہ بڑی مشکلوں کے بعد اب یہ حسرت پوری ہو رہی تھی۔

”جنگل بڑے بھیانک اور سنسان ہیں۔ اگر مجھے خبط نہ ہوتا تو کبھی کا چھوڑ چھاڑ کر بھاگ آتا۔ اتنے بڑے بھائیں بھائیں کرتے ہوئے بنگلے میں تو مارے ہول کے پاگل ہو جاتا۔ لیکن بس یہی امید تھی جس نے ہمّت بندھائے رکھی اور اب جنگل میں منگل ہو جائے گا۔ وہی ویران بنگلہ بھرا بھرا لگے گا۔“

”تب تو وہ بڑی خوبصورت ہوں گی۔“

”ہاں کچھ ہیں ہی۔ بس جیسی بھی ہیں، مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ بہت ہی اچھی۔“

”یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ بس اچھی لگتی ہیں۔ بھلا انہیں بھی تمہارا خیال ہے کچھ؟“

”اس سے مجھے کیا؟ ہو یا نہ ہو۔ کیا اتنا کافی نہیں کہ میں انہیں اس قدر عزیز سمجھتا ہوں۔ پھر انہیں میرا خیال کیونکر نہ ہو گا؟“

میں اس بھولے پن پر مُسکرا دیا۔ کتنا سیدھا سادہ ہے یہ؟ واقعی جیسی بھی لڑکی ہوئی اس کے ساتھ خوش رہے گی۔ اس کے بعد دیر تک مقبول اپنی منسوب کی باتیں سناتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے مستقبل کے متعلق طرح طرح کے پروگرام بتائے۔

"ان کا نام کیا ہے؟"

بولے۔ "نسرین۔"

میں چونک پڑا۔ "نسرین؟"

"ہاں ہاں نسرین۔ تمہارے گھر آیا کرتی تھی۔ شاید تم نے اسے دیکھا بھی ہو۔"

اور میں نے اسے دیکھا تھا۔ کتنی ہی مرتبہ۔

میں اسے بہت دِنوں سے جانتا تھا۔ کتنی دفعہ اس سے باتیں کیں۔ مدّتوں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مقبول اٹھ کر چلے گئے۔ میرے دل میں الجھن سی پیدا ہو گئی تھی۔۔۔ نسرین جا رہی ہے۔ مقبول کے ساتھ۔

یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے زندگی سے کچھ نکل گیا ہو۔ بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ نہ جانے وہ من موہنی بھولی بھالی لڑکی کیوں رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ کوئی خاص بات بھی تو نہ تھی۔ اس سے میں ہمیشہ اجنبیوں کی طرح پیش آیا اور اب تو وہ مقبول کے ساتھ جا رہی ہے جو اسے پوجتا ہے۔ اس کی ناز برداریاں کرے گا۔ مقبول کی زندگی میں خوشگوار تبدیلیاں آ جائیں گی۔ جنگل میں منگل ہو جائے گا۔

میں آپا کے کمرے میں چلا آیا۔ کہا اپنے البم دکھاؤ۔ ذرا سی دیر میں اکتا گیا۔ پھر تاش کھیلنے بیٹھے، لگاتار ہارے گیا۔ آپا میری پارٹنر تھیں، انہوں نے پتّے میز پر مارے اور بولیں۔ ”نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ کھیل میں تو دھیان ہی نہیں ہے۔ اب اس سے زیادہ نہیں ہارا جاتا۔“ وہاں سے سیدھا بچّوں میں جا شامل ہوا۔ ان کے ساتھ کھیل رہا لیکن جلد ہی واپس آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو یوں بہلانے سے کیا فائدہ؟ مان کیوں نہیں لیتا کہ اس خبر سے تجھے افسوس ہو رہا ہے۔

میں باہر باغیچے میں چلا آیا۔ ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔

مجھ پر جیسے غنودگی طاری ہو گئی۔ تصور میں جیسے سچ مچ سامنے ایک چہرہ آ گیا۔ گلابی دمکتا ہوا چہرہ جس کے دونوں طرف گھنگھریالے بال لہرا رہے تھے۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھیں اور دو نشیلی آنکھیں مجھے دیکھنے لگیں۔۔ آنکھیں جن میں بے انتہا ملائمت تھی۔ پھر گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ننّھے مُنّے ہونٹ لرزنے لگے۔ جیسے کچھ کہہ دیں گے۔ لیکن انہوں نے کچھ نہ کہا۔ بس لرز کر رہ گئے۔

مجھے نسرین کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ ایک ایک کر کے ساری تصویریں سامنے آ گئیں۔ کئی سال پہلے کی بھی، جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔

اس روز کرکٹ کھیلنے کے لیے جاتے وقت مجھے یونہی خیال آ گیا کہ ذرا خوشبو لگاتے چلیں۔ گیند پھینکتے وقت اگر کبھی کبھار خوشبو کی لپٹ آ جائے تو تکان محسوس نہیں ہوتی۔

میں نے بنّو کو آپا کے کمرے میں بھیجا کہ ان کی میز سے نیلے رنگ کی لمبی سی شیشی اٹھالا۔ مجھے یقین تھا کہ آپا ابھی کالج سے واپس نہیں آئی ہوں گی۔ بنّو واپس آئی تو ایک سندیسے کے ساتھ۔۔۔ آپا مجھے بلا رہی ہیں۔

پوچھا "کیوں؟" بولی "پتہ نہیں۔"

میں گھبرا گیا۔ یہ کون سا وقت ہے بلانے کا۔ ضرور کوئی کام بتائیں گی اور اچھے بھلے دن کا ستیاناس ہو جائے گا۔ ٹال مٹول کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ مجبوراً جانا پڑا، لیکن عجیب حلیے میں۔ بکھرے ہوئے بال، گلا کھلا ہوا، ہاتھ میں کالج کا بلیزر اور پاؤں میں کرکٹ کے میخوں والے جوتے، جو پکّے فرش پر بُری طرح شور مچا رہے تھے۔

ان کے کمرے میں ڈرتا ڈرتا داخل ہوا۔

"یہی ہے وہ خبطی!" وہ بولیں

اور ایک حسین لڑکی کو دیکھا کہ جس کے پریشان بال پنکھے کی ہوا سے اور بھی پریشان ہوئے جاتے تھے۔

"سلام کرو انہیں۔" آپا نے کہا۔

سلام کروں؟ خواہ مخواہ۔ نہ جانے کون ہیں یہ؟

آپا نے گھور کر دیکھا اور تنگ آ کر میں نے ذرا سا سر ہلا دیا اور واپس آنے لگا۔

"دیکھ لیا نا بس۔۔۔۔ بالکل پگلا سا ہے، جیسا میں کہا کرتی تھی؟" آپا بولیں اور میں گھبرا کر بلیزر پہننے لگا۔

بڑی مشکل سے آپا نے ذرا دیر مجھے وہاں بٹھایا۔ میں فوراً بھاگنا چاہتا تھا۔ بس رسّے تُڑا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا شیشے توڑ کر کھڑکی میں سے نکل جاؤں۔

بعد میں آپا نے بتایا کہ اس لڑکی کا نام نسرین ہے۔ ایک ہم جماعت اور بڑی عزیز سہیلی ہے۔ آپا نے اس شام مجھے دکھانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ میں آپا سے خوب لڑا کہ میرا ذکر آپ سب سے کیوں کرتی ہیں۔ ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ کہنے کے بجائے کسی اخبار یا رسالے میں کیوں نہیں چھپوا دیتیں۔ کئی روز تک میں روٹھا رہا۔

پھر ایک روز میں کھیل کر تھکا ہوا آیا تو آپا نے کہا کہ مجھے سینما لے چلو۔ پہلے کسی سہیلی کے یہاں پارٹی تھی۔ چائے کے بعد سینما جانا تھا۔ پارٹی کا وقت نکل چکا تھا، البتہ سینما پہنچ سکتے تھے۔ میں سہیلیوں کے نام سے گھبرا گیا۔ بہتیرے بہانے پیش کیے۔ تھکا ہوا ہوں سر میں درد ہے۔ پاؤں میں موچ آ گئی ہے۔ کسی اور کو ساتھ لے جائیے۔ لیکن ایک نہ چلی۔

پھر سوچا کہ کسی طرح دیر کر دیں۔ آپا سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”میں ذرا کپڑے بدل لوں؟“

”نہیں یونہی چلو۔“ وہ بولیں۔

”لیکن میرا حلیہ تو دیکھئے، خاک دھول میں اَٹا ہوا ہوں۔“

”تو پھر کیا ہوا۔“ وہ ڈانٹ کر بولیں۔ ”بلایا مُجھے ہے، تمھیں نہیں۔ اور پھر ان لڑکیوں میں سے تو تمھیں کوئی جانتی بھی نہیں۔“

لڑکیوں کے نام پر مجھے رونا آگیا، آخر کون چاہتا ہے کہ ان کی سہیلیوں کے سامنے جائے؟ خوامخواہ کی مصیبت ہے۔ مجبوراً اسی طرح ساتھ ہو لیا۔

ویسے بہتیرے جتن کیے۔ کار کو پیچیدہ اور لمبے راستوں سے لے گیا کہ کسی طرح دیر ہو جائے لیکن بد قسمتی سے وقت پر سینما پہنچ گئے۔ ہمارے پہنچتے ہی پکچر شروع ہو گئی۔ اندھیرے میں اندر جانا پڑا۔ آپا کو اپنی سہیلیوں کی پڑی۔ مجھے بھی کہا گیا کہ میں بھی جھانکوں۔ دو قطاریں چھوڑ کر لڑکیوں کی پلٹن بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اشارہ کیا۔ انہوں نے دیکھا تو واقعی وہ ان کی سہیلیاں ہی تھیں۔ پیچھے جگہ نہیں تھی۔ ورنہ شاید آپا پیچھے چلی جاتیں۔

"اور آپ کے پاس جگہ ہے کیا؟" پچھلی قطار سے آواز آئی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، یہ نسرین تھی۔

"ہے تو سہی، مگر بس ایک کے لیے۔" آپا بولیں۔

"تو میں آجاؤں؟" نسرین نے پوچھا۔

آپا نے اپنے اور میرے درمیان کی سیٹ سے اپنا چرمی بٹوا اٹھا لیا۔ ادھر مَیں کسمسایا۔ یہ تو سچ مچ نسرین آرہی تھی۔

"میں ذرا آگے چلا جاؤں؟" میں نے آپا سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ پہلے ہی خفا تھیں۔

"آخر تمہیں لڑکیوں سے وحشت کیوں ہے؟ بیٹھے رہو چپ چاپ۔ یہ کوئی جن ہے یابلا۔ تمہیں کچھ نہیں کہے گی۔"

وہ میرے ساتھ آ بیٹھی اور ساری فضا معطّر ہو گئی۔

کچھ دیر کے لیے میری گردن جیسے پتھر کی بن گئی۔ بس اکڑ کر سیدھا دیکھتا رہا۔ پھر ایک آدھ مرتبہ کنکھیوں سے اسے دیکھا اور پھرتی سے پھر اسی طرح سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

ویسے اس لڑکی کو لباس پہنے کا سلیقہ ہے۔ اس دن بھی کیسے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، آج بھی لباس موزوں ہے۔ کوئی چیز بھی بے تکی نہیں پہنی ہوئی۔ کیسی گڑیا سی لگ رہی ہے۔

مجھے آپا کی کئی سہیلیاں یاد آ گئیں جو ایسے ایسے عجیب لباس پہنتی تھیں کہ مجبوراً سب نے ان کے نام رکھے ہوئے تھے۔۔۔ طوطا پری۔۔۔ فاختہ۔۔۔ مسز بھوت (جو ہمیشہ سیاہ کپڑے پہنتی تھیں، نہ جانے کس غم میں؟) نیل گائے۔۔۔ باگڑبِلا۔۔ تہمد پوش۔ مکی ماؤس۔

آپا اور نسرین کی سرگوشیوں نے مجھے چونکا دیا جو کافی دیر سے ہو رہی تھیں، اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ پکچر کے کسی ایکٹر کا ذکر ہو رہا تھا اور پھر میرا، اور پھر ایک دوسرے کے کان میں کھُسر پھُسر۔

نسرین نے پوچھا۔ ''تو آپ اسے کہہ رہی ہیں؟'' اس وقت پردے پر ایک تین من کا پلا ہوا ہیرو کھڑا تھا۔ اور کسی کے عشق میں اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

آپا بولیں۔ ''نہیں، نہیں، یہ نہیں، ابھی ابھی تو آیا تھا۔ پھر آئے گا ہاں وہ رہا!''

پردے پر ایک چھ فُٹّا، لمبوترے چہرے کا مضبوط انسان تھا جس کی بدتمیزیاں ساری کہانی پر چھائی ہوئی تھیں۔ کسی سے ذرا سا اختلاف ہوا اور اسے وہیں پیٹ ڈالا۔ چلتے چلتے ستون سے کہنی لگ گئی اور بھُنّا کر ایک مکّا ستون کو رسید کر دیا اور چلا بھی تھا تو عجیب شان سے۔ مٹھیاں کسی ہوئیں۔ سینہ نکلا ہوا۔ گردن اکڑی ہوئی، ہونٹوں پر ایک عجیب سا تناؤ جسے مُسکراہٹ بھی نہیں کہہ سکتے۔ پکچر کے سب افراد اس سے ڈرتے تھے، مگر تھا بالکل اُجڈ۔ عقل تو پاس سے بھی نہ گزری تھی۔

آپا آہستہ سے بولیں۔ ''دیکھ لیا نا کتنا ملتا جلتا ہے۔ ہو بہو وہی ناک نقشہ ہے۔''

اور مجھے آگ لگ گئی۔ گویا مجھے اس بد تمیز جیسا بنایا جا رہا تھا۔

نسرین نے چپکے سے کہا۔ ”کہاں ملتا ہے؟ بس قد ملتا ہے اور سینہ! باقی شکل تو۔۔۔“

”تُو تو خواہ مخواہ حمایت کرے گی۔“ آپا بولیں۔ ”شکل ہی میں کیا ہے، بالکل ایک جیسی تو ہے۔“

اور میرے جی میں آیا کہ مٹھیاں بھینچ کر چیخیں مارتا ہوا آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات پر مکّوں کی بارش کر دوں اور پھر چھلانگ مار کر بھاگ جاؤں۔

”بالکل ملتا ہے۔“ آپا پھر بولیں۔

تو گویا میری یہ عزّت افزائی ہو رہی ہے۔ آئیں بڑی آپا کہیں سے۔ ہر ایک سے میری برائی کرتی ہیں۔ میرا دل باغیانہ خیالات سے لبریز ہو گیا۔

انٹرول ہوا اور مَیں مُنہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ نسرین نے مجھے چاکلیٹ دینے چاہے۔ میں نے اِدھر دیکھا ہی نہیں۔ آپا نے پھر ہلکی سی ڈانٹ دی اور ڈر کر مجھے چاکلیٹ لینے پڑے۔

لیکن نہ جانے وہ تھے ہی کڑوے یا مجھے لگے۔

میں ان کی باتوں میں بالکل شریک نہ ہوا۔

پکچر پھر شروع ہوئی۔ بد قسمتی سے اب ان صاحب کا اصلی پارٹ شروع ہوا۔ دو آدمیوں کو گردن سے پکڑ کر ہوا میں لٹکا دیا۔ مُکّا مار کر ایک دروازہ توڑ دیا۔ ایک چھوٹی سی نہر کو پھلانگ گئے۔ آپا ہیں کہ ہنس بھی رہی ہیں اور چپکے چپکے نسرین سے بھی کہے جا رہی ہیں اور میرا غصّے سے برا حال ہے۔

اب ایک نئ مصیبت شروع ہوئی۔ اتفاق سے ایک لڑکی ان صاحب سے محبّت کرتی تھی۔ اس بیچاری نے کئ مرتبہ ظاہر کرنے کی کوشش کی، لیکن ایسے اناڑی کیسے سمجھتے، محبّت کی قسم کا کوئی جذبہ ان کے دل میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ آخر جب فلم کے اختتام پر دونوں جُدا ہونے لگے تو لڑکی نے ہمّت کر کے کہہ ہی دیا کہ مجھے تم سے محبّت ہے۔

یہ بہت سٹپٹائے کہ یہ کیسی آفت نازل ہوئی۔ کچھ دیر تو مُنہ بنائے سوچتا رہا، پھر بڑی سادگی سے بولے۔ ”اُفّوہ! یہ تم نے شروع میں کیوں نہیں بتایا۔ بھلا اب میں کیا کر سکتا ہوں؟“

یہ کہہ کر سلام کیا اور سگریٹ مُنہ میں دبا کر چل دیئے۔

اس پر آپا اور نسرین جو ہنسی ہیں تو بس طوفان سا آ گیا۔ میں وہاں سے ہیٹ چھوڑ چھاڑ بھاگا اور کار لے کر سیدھا گھر پہنچا۔ دیر تک متعلقین کو کوستا رہا۔ طرح طرح کے خطرناک منصوبے دل میں باندھے لیکن جلد ہی کسی ہنس مکھ دوست کا فون آ گیا۔ اس نے مجھے کھانے پر بلایا اور جب واپس آیا تو میں نے آپا کی خطا کسی حد تک معاف کر دی تھی۔

اس کے بعد کئی مرتبہ آپا اور نسرین کو سینما لے جانے کی ڈیوٹی لگی، لیکن میں ہمیشہ ٹال مٹول کر کے وہاں سے بھاگ آیا کرتا۔ ایک شام کو تالاب پر جا رہا تھا۔ تیرنے کا لباس پہن کر اُوپر ڈریسنگ گاؤن اوڑھے کار کا انتظار کر رہا تھا جسے کوئی لے گیا تھا۔ سوچا کہ اتنے میں ہاتھ پیر کھول لیں۔ باغ کی طرف چلا گیا۔ ذرا ہی اچھل کود کی ہو گی کہ آپا کے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ فوّارے کے پاس آپا اور نسرین بیٹھی چاء پی رہی تھی۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ آخر کیا مصیبت ہیں یہ نسرین؟ سائے کی طرح کیوں پیچھے لگی ہیں؟ ایک آپا ہی کیا کم ہیں جو یہ اور تشریف لے آئیں۔

”بس بھئی اب جانے دو۔“ آپا ہنستے ہوئے بولیں۔ ”آؤ تمہیں چاء پلائیں۔“

''شکریہ! مجھے تیرنے میں دیر ہو رہی ہے۔''مَیں چلتے ہوئے بولا۔

''اچھا تو یہ تیرنے کی تمہید باندھی جا رہی تھی۔ یہ لڑکا بھی عجیب ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہ ہو گی جس کا خبط اسے نہ ہو چکا ہو۔ زمانے بھر کے کھیل، تصویر کشی، ایکٹنگ، فوٹو گرافی، شاعری اور نہ جانے کیا کیا الم غلم۔۔۔بس جب دیکھو کسی چکّر میں ہیں۔ لیکن کبھی کچھ کر کے نہ دکھایا۔ اور یہ ڈرامے کے تمغے؟ کالج کا کلر؟ اتنے سارے کپ؟ نمائش والی تصویر؟ اور یہ تعریفی خطوط؟ اور وہ۔۔۔؟''

''وہ تو ہو نہی ہو گیا اتفاق سے۔'' آپا شرارت آمیز تبسم سے بولیں۔ ''ورنہ بھئی سچ پوچھو تو تم ہو بس یو نہی! اب اسی تیرنے کو لے لو۔ دو سال سے تم اسے یوں چمٹے ہو کہ اور کوئی ہو تا تو شاید مچھلی بن جاتا لیکن۔''

''تو اس سال دیکھ لینا!'' مجھے غصّہ آ رہا تھا۔

''کیا دیکھ لینا؟ اتنے سال سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ پچھلے سال (نسرین سے) انہوں نے اتنا مجبور کیا کہ ہمارا کرکٹ میچ دیکھو۔ صبح شام بس یہی وظیفہ رہ گیا تھا۔ خیر میچ دیکھنے گئے۔ کہنے لگے کہ میں بولنگ بہت اچھی کرتا ہوں۔ جو اُلٹی سیدھی گیندیں پھینکنی شروع کیں تو لوگ ہنستے ہنسے پاگل ہو گئے۔ دوسری ٹیم کا سکور

بے تحاشا بڑھ گیا۔ تنگ آ کر کپتان نے ان سے گیند لے لی۔ خیر ہم سمجھے کہ کچھ سکور ہی کریں گے۔ جب پیڈ وغیرہ باندھ کر بڑی شان سے گئے تو پہلی ہی گیند پر آؤٹ!"

آپا اسّی فیصدی جھوٹ بول رہی تھیں۔

"لیکن میں نے سنا ہے یہ بہت اچھا کھیلتے ہیں۔" نسرین بولی۔

"سُننے کا کیا ہے۔ سُنتے تو ہم بھی یہی تھے۔ اس روز جا کر دیکھ جو آئے۔" آپا بولیں۔ اب زیادتی ہو رہی ہے۔ مَیں مُنہ بسور کر چل دیا۔

"ارے! ناراض ہو گئے۔۔۔! لو یہ ایک اور خصوصیت ہے ان کی۔ ذرا سی بات پر ناک چڑھ جاتی ہے اور پھر رُوٹھ جائیں تو دیر تک نہیں منتے۔۔۔" اور مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔

دونوں ہیں کہ بڑے اطمینان سے چائے پی رہی ہیں اور میں بیٹھا انگلیاں چٹخا رہا ہوں۔ کچھ دیر تو انتظار کیا پھر خود ہی چاءدانی کی طرف لپکا۔

"اُفّوہ! بڑے بے صبرے ہو۔" آپا بولیں۔ "آخر یوں گُم سُم ہو کر کیوں بیٹھ گئے۔ ان سے کہو کہ چاء بنائیں تمہارے لیے۔"

اور مَیں اس وقت کو کوس رہا تھا جب باغ کا رُخ کیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے نسرین کی طرف دیکھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے چاء بنائی۔ اب جو پیالی میری طرف بڑھائی ہے تو میری جانب دیکھا بھی اور گرم گرم چاء سے میرا گاؤن بھر گیا۔

"معاف کیجیے!" ان ننّھے مُنّے ہونٹوں سے آواز آئی۔ میں گاؤن جھاڑ رہا ہوں اور آپ کہہ رہی ہیں۔ "چلو کیا ہوا؟ وہاں تالاب میں بھی تو بھیگتا ہو گا۔ ایک پیالی اور بناؤ۔" دوسری پیالی بھی نسرین نے پھر میری طرف دیکھا اور پھر ساری چاء گاؤن پر لاحول ولا قوۃ اس نے جلدی سے اپنا چھوٹا سا رومال مجھے دے دیا کہ گاؤن خشک کر لوں۔ اس دن میں تالاب پر نہ جا سکا۔ اندھیرا ہونے پر باغ میں ورزش کرنی پڑی۔ پھر ایک شام کو میں ذرا دیر سے گھر پہنچا۔ میرے کمرے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ اندر کوئی ساری چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ یہ ہے کون؟ میں چوکنا ہو گیا۔ نوکر تو یہ ہو نہیں سکتا۔ نہ ہی بنّو ہو گی۔ شاید کوئی بچّہ ہو۔ جو دبے پاؤں اندر گیا تو کوئی ہڑبڑا کر بھاگا اور دوسرے دروازے سے نکل گیا۔ لپک کر کھڑکی تک پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک سایہ تیزی سے آپ کے کمرے میں گھس گیا۔ کمرے میں ساری چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ صندوق کھلے ہوئے تھے۔ کپڑے کتابوں میں رکھے تھے۔ ٹائم پیس جوتوں میں رکھا تھا۔ سارے کپ

چارپائی کے نیچے پڑے تھے اور کیمرہ فرش پر۔ بڑا جھنجلایا۔ یہ حادثہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی میرے کمرے میں اسی قسم کا بھونچال آچکا تھا۔ آخر یہ کون؟ اور اسے اس حرکت میں کیا لطف آتا ہے؟ میں نے تہیّہ کر لیا کہ آج ضرور سراغ لگاؤں گا۔ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ کہیں آپا نہ ہوں۔ بس وہی ہوں گی میری تلاشی لے رہی تھیں اور مجھے آتا دیکھ کر جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اگر یہ بات ہے تو ان سے آج خوب لڑوں گا ناراض ہوتی ہیں تو ہو جائیں۔ دراصل قصور میرا ہے۔ یہ کچھ اتنی بڑی بھی نہیں اور مُفت میں اتنا رعب ڈالتی رہتی ہیں۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ کمرے کو جھنجھوڑ جاتی ہیں۔۔۔ اور جو ان کے کمرے میں چلے جاؤ تو مصیبت آجاتی ہے۔ ہدایت پر ہدایت ملتی ہے۔ گلدان کو ہاتھ نہ لگانا، ٹوٹ جائیں گے۔۔۔ تصویروں کو دور ہی سے دیکھ لو۔۔۔ کتابوں کو اُلٹ پلٹ نہ کرو۔۔۔ یہ البم ذرا حفاظت سے دیکھنا، تمہارے ہاتھ میلے تو نہیں۔۔۔ بس آج ان سے ضرور لڑوں گا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا اور دبے پاوں باہر نکلا۔ ان کا کمرہ خالی تھا۔ کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہوں تو پلاٹ میں اچھی خاصی کانفرنس ہو رہی تھی۔ آپ کی بیسیوں سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ کوئی چھوٹی موٹی پارٹی ہو گی شاید۔ اور اب کھیل کھیلے جا رہے تھے۔

پھر سوچا کہ یہ موقع تو لڑائی کے لیے مناسب نہیں۔ کل سہی، کل لڑیں گے۔ لیکن کل تک کہیں غصّہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اور کل آپا بھی شیر ہو جائیں گی۔ کہہ دیں گی کہ مجھے کیا پتہ کون تھا؟ اور اب تو باقاعدہ ثبوت موجود ہے۔

خیر! اب جائیں کس طرح؟۔۔۔ سامنے سے جانا تو ٹھیک نہیں، البتہ اگر پرلی طرف سے چکر لگا کر اناروں کے جھنڈ میں سے آؤں تو کچھ امید ہو سکتی ہے کیونکہ وہ کھیل ہی ایسا تھا کہ لڑکیاں بھاگتی تھیں اور دُور دُور چلی جاتی تھیں۔

کبھی نہ کبھی تو آپا اس پودے کے پاس سے گزریں گی جہاں میں چھپا ہوں گا، بس انہیں پکڑ کر ایسا ڈراؤں گا کہ یاد ہی تو رکھیں گی۔

میں دبے پاؤں سرو کے درختوں کی آڑ لیتا، خاردار ٹہنیوں سے بچتا، اناروں کے جھنڈ کی طرف چلا۔

چاندنی خوب چھٹکی ہوئی تھی۔۔۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں نظر نہ آ جاؤں۔ اسی ہیر پھیر میں اناروں کے جھنڈ میں کئی مرتبہ گرا بھی۔ آخر ایک جگہ چھپ گیا بالکل جھنڈ کے کنارے، جہاں سے لڑکیاں گزرتی تھیں۔ کافی دیر سوچنے کے بعد یاد آیا کہ آپا نے سہ پہر کو آسمانی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ میں وکٹ کیپر کی

طرح جھکا ہوا تاک میں کھڑا تھا۔ اتنے میں ایک آسمانی دوپٹہ گزرا اور میں بے تحاشا قلانچ مار کر پیچھے بھاگا۔ انہیں جب پتہ چلا کہ تعاقب کیا جارہا ہے تو دُگنا تیز دوڑنے لگیں۔ میں نے جان بوجھ کر رفتار تیز نہ کی۔ کہاں تک دوڑیں گی، ابھی منٹوں میں پکڑے لیتا ہوں۔

انہوں نے دو چار چھوٹے چھوٹے نالے پھلانگے۔ پھولوں کے تختے میں سے گزرتے ہوئے ان کی اوڑھنی بھی الجھ کر رہ گئی۔ انہوں نے سنگترے کے پودوں میں جو دُور دُور کھڑے تھے۔ مجھے خوب چکر دیئے۔ ان کے جوتے بھی کہیں رہ گئے۔ اب وہ بالکل ننگے پاؤں تھیں، لیکن بدستور دوڑ رہی تھیں۔ یکا یک وہ بید مجنوں کے پودوں میں چھپ گئیں۔ میں نے ذرا سی تلاش کے بعد انہیں دیکھ لیا۔ دبے پاؤں پیچھے سے جا کر بازوؤں میں دبوچ لیا اور خوب زور سے ہلایا اور پھر ان کے کان میں بڑی ڈراؤنی آواز سے کہا۔ "ہاؤُو۔ ہاؤُو۔ وو۔"

جب اچھی طرح جھنجھوڑ چکا تو دیکھتا ہوں کہ یہ تو نسرین تھی۔۔۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ یہ کیا کہتی ہوگی؟ اب میں ہوں کہ معافی مانگ رہا ہوں۔ "دیکھیے۔۔۔ مجھے غلط فہمی ہوئی۔۔۔ میں سمجھا آپا ہیں۔۔۔ آپا نے آج میری چیزوں کو چھیڑا تھا اس

لیے!۔۔۔ آپ نے پہلے کیوں نے بتایا کہ آپ ہیں!" پھر میں نے شبّو کی چند کلیاں جلدی سے اسے دیں۔ بڑی گھبراہٹ میں، جیسے رشوت دے رہا ہوں۔

وہ کچھ دیر میرے سامنے کھڑی رہی۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھائے حیرت سے مجھے دیکھتی رہی۔ چاندنی میں وہ سنگِ مرمر کا مجسمہ لگ رہی تھیں۔ شاید تب مجھے پتہ چلا کہ نسرین بہت خوبصورت لڑکی ہے۔

کچھ دیر تک ہم اس کے جوتے ڈھونڈتے رہے۔ ایک بڑے سے گلاب کے پودے میں اٹکی ہوئی اس کی اوڑھنی ملی جسے بڑی مشکل سے بحفاظت اتارا گیا۔

آخر چلتے ہوئے اس نے بتایا کہ آپا تو شام سے پلاٹ میں تھیں۔ وہ تو کہیں گئی ہی نہیں۔

"اور کمرے میں کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

بولی "کوئی اور ہوگا تصویریں دیکھ رہا ہوگا۔"

مَیں دیر تک سوچتا رہا۔ شاید نسرین میری تصویریں دیکھنے آئی تھی، مگر کیوں؟

اس کے بعد میں نے بہت دنوں تک نسرین کو نہیں دیکھا۔ آپا کی سب سہیلیاں آتیں، مگر وہ نہ ہوتی۔

دن بھر میچ کھیل کر تھکا ہوا ایک آرام کرسی پر لیٹا تھا۔ میرے پاس چھوٹا سا ریڈیو رکھا تھا جسے میں ایک تار لگا کر وہاں لے آیا تھا۔ دھیمی دھیمی آواز میں ستار کی کوئی گت بج رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھاگے جا رہے تھے۔ کوئی ٹکڑا چاند پر آجاتا تو چاندنی دھندلی پڑ جاتی۔ لیکن جلد ہی وہ ٹکڑا ہٹ جاتا اور پھر چاندنی کھل جاتی۔

میں سامنے سرو کو دیکھ رہا تھا جس پر کبھی چاندنی تیز ہو جاتی، کبھی دھندلی۔ ایک تاریک سی بدلی چاند پر آگئی اور بالکل اندھیرا ہو گیا۔ سرو کا درخت محض ایک سایہ سا نظر آنے لگا۔ آہستہ آہستہ ظلمت دُور ہوئی اور اُجالا آیا۔

سرو کے ساتھ ایک اُجلے سائے کو دیکھا۔ جب چاند پوری طرح چمکنے لگا تو وہ شبیہ اور بھی واضح ہو گئی، جیسے سنگِ مرمر کا مجسمہ ہو۔ اور جب ہوا سے اس کے بال لہرائے تب پتہ چلا کہ یہ نسرین تھی۔ آپا نے دو تین روز پہلے بتایا تھا کہ وہ بیمار تھی۔

وہ ریڈیو کو ایک طرف سرکا کر میز پر بیٹھ گئی۔ پہلے سے کہیں دُبلی ہو گئی تھی۔ رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ پہلے گلابی جھلک تھی اور اب بالکل سفید ہو گیا تھا جو چاندنی میں بڑا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اُلٹے سیدھے فقروں میں اس کی طبیعت پوچھی، بیماری پر افسوس ظاہر کیا۔ پتہ چلا کہ اس کا دل بہت دھڑکنے لگا تھا۔

"کیا بہت زیادہ دھڑکتا تھا؟"

"جی ہاں، اور بعض اوقات تو اتنا کہ اگر میرے پاس آپ ہوتے تو دور سے سن لیتے۔" وہ بڑے بھولے پن سے بولی۔

چند باتیں اور ہوئیں، پھر اس نے پوچھا۔ "ایک بات ہے۔ سچ سچ بتائیں گے آپ؟"

"ہاں ہاں پوچھیے۔"

"اگر میں بیماری کے دنوں میں آپ کو بلاتی تو آپ مجھے دیکھنے آجاتے کیا؟"

"ہاں ہاں، آجاتا۔۔۔ بھلا اس میں کیا ہے؟ ضرور آجاتا۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی، پھر بولی۔ ”جانتے ہیں میں نے کیوں نہیں بلایا؟ مجھے یوں محسوس ہوا کرتا جیسے آپ میرے سرہانے بیٹھے ہیں۔ اپنے ماتھے پر کئی دفعہ آپ کا ہاتھ محسوس کیا۔ آپ نے کتنی ہی مرتبہ میری ہمّت بندھائی۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب آپ مجھے دیکھنے نہ آئے ہوں اور آپ ہمیشہ مُسکراتے رہتے۔“

”تو چلیں اب؟ کافی دیر ہو گئی ہو گی!“ میں نے اپنی کلائی دیکھی جو خالی تھی۔۔۔
”اُفّوہ! گھڑی بھول آیا ہوں!“

”یہ لے لیجئے!“ وہ اپنی چھوٹی سی گھڑی اتارنے لگی۔

”جی نہیں، گراؤنڈ میں رہ گئی ہو گی کہیں۔ صبح مل جائے گی!“

لیکن وہ مجھے اپنی گھڑی دے رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔۔۔ اور پھر یہ گھڑی؟ ذرا سی تو ہے بالکل۔“

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اگر میں گھڑی دینا چاہوں تو آپ نہیں لیں گے؟“ اس نے بے بسی سے پوچھا۔

"مگر۔۔۔ وہ دیکھئے نا۔۔۔ اچھا پھر کبھی سہی!" میں انکار کر رہا تھا۔ لیکن اس نے گھڑی میرے ہاتھ میں دے دی جسے میں نے واپس کرنا چاہا اور واپسی کرتے ہوئے اس کی کلائی کو ذرا جھٹک دیا۔ یکلخت اس کا چہرہ اتر گیا۔

"تو آپ نہیں لیں گے اسے؟" وہ بالکل چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مُندنے لگیں اور وہ چکرا کر گرنے لگی۔ میں نے جلدی سے اسے بازوؤں میں تھام لیا اور چاند پر ایک تاریک بدلی چھا گئی۔

جب تک اندھیرا رہا۔ میں اسے تھامے کھڑا رہا۔ ایک لطیف اور معطّر شے کو جیسے کلیوں کا ہار ہو۔ خوشبو دار اور ہلکا پھلکا!

مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل تو پہلے ہی کمزور تھا اتنے دنوں سے تو بیمار تھی۔ اور جب وہ بدلی ہٹی اور اجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں یوں مُندی ہوئی تھیں جیسے حفاظت میں آ کر سو گئی ہو۔۔۔ میں اسے فوّارے تک لے گیا جہاں اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

پھر عید آئی رات بھر طرح طرح کے رنگین خواب دکھائی دیئے۔ میں نے گلاب کے بڑے بڑے پھول دیکھے، کنول کے پھولوں جتنے۔ پھر ایک نیلی جھیل

دیکھی، جس میں رنگ رنگ کی پنکھڑیاں تیر رہی تھیں اور ان پر شوخ تتلیاں ناچ رہی تھیں۔ غروبِ آفتاب دیکھا۔ بے شمار پرندے دیکھے جو اُڑتے اُڑتے شفق کی سرخی میں غائب ہو جاتے تھے۔ پھر جیسے رات ختم ہونے کو آئی۔

اب نیا خواب شروع ہوا۔۔۔ میں کُچھ سو رہا تھا، کچھ جاگ رہا تھا۔ کوئی چپکے سے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔ پھر شاید میں نے کروٹ لی اور خواب دھندلا پڑ گیا۔

مدھم سی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ لیکن جلد ہی اندھیرا چھا گیا اور تسلسل پر قائم ہو گیا۔

میرا بازو کسی نے تھام رکھا تھا۔ انگلیوں کی گرفت تیز ہوتی گئی۔ پھر مَیں نے کروٹ لی۔ اس مرتبہ میں جاگ اٹھا!

پھر جیسے یکلخت کوئی کمرے سے باہر نکل گیا۔۔۔ پردہ ہل رہا تھا۔ جانے والے کی ایک جھلک سی دیکھی۔ یوں لگا جیسے نسرین ہو۔

سورج کبھی کا نکل آیا تھا۔ شاید مجھے جگانے آیا تھا۔

ایک طرف کسی کا ننھا سا رومال پڑا تھا۔ جب میں نے میز پر رنگین عید کارڈ دیکھا جسے نسرین نے خود بنایا تھا، تب یقین آگیا کہ وہی تھی۔

عید کے دن وہ دیر تک ہمارے ہاں رہی۔ مجھے بھی کچھ دیر کے لیے ملی۔ اس کی بڑی بڑی معصوم آنکھیں اداس سی تھیں، اگرچہ وہ مُسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

کئی دن تک اپنے بازو پر نسرین کی انگلیوں کی گرفت محسوس کرتا رہا۔

پھر گرمیاں آ گئیں۔ میں امتحان میں مصروف ہو گیا۔ چھُٹیاں سیاحت میں صرف کر دیں۔

بس یہاں آ کر یہ تصویریں ختم ہو جاتی تھیں۔ میں نسرین کو اتنا ہی جانتا تھا۔

اب وہ دُور کہیں جنگلوں میں چلی جائے گی۔ شاید اب ہم کبھی نہ ملیں اور میں اس بھولے بھالے چہرے کو نہ دیکھ سکوں جس کے دونوں طرف گھنگھریالے بال ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جایا کرتے تھے۔

وہ آنکھیں شاید مجھے کبھی حیرت سے نہ دیکھیں اور ان گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں کی لرزش کبھی محسوس نہ کر سکوں جو شاید کچھ کہنا چاہتے تھے اور نہ کہہ سکے۔ یا شاید یہ سب نرا واہمہ تھا۔

نہ جانے مجھے کیوں رنج ہو رہا تھا۔ بے حد اداس تھا جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ میرے سامنے بید مجنوں کی ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں۔ چمکیلے سورج کی شعاعیں چکنے چکنے پتوں پر ناچ رہی تھیں، لیکن ٹہنیوں پر کچھ ماتم سا تھا۔ پتّے رنجیدہ سے تھے۔ چمکیلی دھوپ بھی اس حزن پر ملمع نہ چڑھا سکی۔ جیسے غمگین دل پر ناپائیدار مسرت کی اتنی سی بھی تہہ نہیں چڑھتی!

بید مجنوں کے ساتھ شبو کے پودے لہرا رہے تھے۔ جب تیز جھونکے آتے تو بید مجنوں کی ٹہنیاں شبو کے حسین پودے سے چھو جاتیں، جس کے نازک اور خوشنما پھول ہوا میں جھول رہے تھے۔۔۔ معطّر پھول، لچکدار ٹہنیاں، پتّے سب لاپروائی سے رقص کر رہے تھے۔

دونوں پودے ساتھ ساتھ تھے۔۔۔ ایک ہی سورج کی جِلا تھی، وہی ہوا کے جھونکے دونوں کو چھیڑ رہے تھے۔

لیکن ایک دوسرے کو چھونے پر بھی شبو کی ٹہنیاں اسے ذرا سی مسرّت نہ دے سکیں۔ اسی بے پروائی سے رقص کرتی رہیں۔

چمکیلے آسمان پر اُجلے اُجلے بادلوں کے گالے اڑے جا رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے ملتے اور کبھی بچھڑ جاتے۔ کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کچھ دُور چلتے۔

جب ملتے تو عجیب عجیب شکلیں بن جاتیں، کئیوں کا رنگ بھی بدل جاتا۔ اور جب علیحدہ ہوتے تب بھی اسی سر گرمی سے دوڑ میں مصروف ہو جاتے اور پتہ بھی نہ چلتا کہ کون کس کے ساتھ تھا۔

شاید زندگی کا دارومدار محض حادثوں پر ہے۔

یونہی اتفاق سے ہم ایک دوسرے کے نزدیک آ جاتے ہیں اور پھر ایک حادثہ ہمیں دُور پھینک دیتا ہے۔ لیکن بادلوں کی طرح وہی انہماک رہتا ہے۔ دوڑ بدستور جاری رہتی ہے!۔۔۔ زندگی کی دوڑ!

فلاسفر

آخر اس گرم سی شام کو میں نے گھر میں کہہ دیا کہ مجھ سے ایسی تپش میں نہیں پڑھا جاتا۔ ابھی کچھ اتنی زیادہ گرمیاں بھی نہیں شروع ہوئی تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ امتحان نزدیک تھا اور تیاری اچھی طرح نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک قسم کا بہانہ تھا۔ گھر بھر میں صرف مجھے امتحان دینا تھا۔ حامد میاں امتحان سے فرنٹ ہو چکے تھے کہ اگلے سال دیں گے۔ ننھی عفّت کو خواہ مخواہ اگلی جماعت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ باقی جو تھے وہ سب کے سب پاس یا فیل ہو چکے تھے۔

لازمی طور پر میری ناز برداریاں سب سے زیادہ ہوتیں۔ طرح طرح کے ناشتے، ذرا ذرا دیر کے بعد پینے کی سرد چیزیں، اور اِدھر اُدھر کے کمروں میں مکمل خاموشی! بچوں کو ڈرایا جاتا کہ خبردار جو ان سے بات کی تو۔۔۔ خبردار جو ان کے

کمرے کے نزدیک سے گزرے۔۔۔ خبردار جو یہ کیا جو وہ کیا۔ یہ امتحان دے رہے ہیں!

ادھر امتحان کمبخت ایسا زبردست تھا کہ کسی طرح کتابیں قابو میں نہ آتی تھیں۔ آخر تنگ آکر میں نے کہہ ہی دیا کہ مجھ سے یہاں نہیں پڑھا جاتا۔ مطلب صاف ظاہر تھا کہ پہاڑ پر جاؤں گا۔ کئی دنوں تک گھر میں یہی ذکر ہوتا رہا۔

آخر ایک دن مجھ سے کہا گیا کہ تیار ہو جاؤں۔ ابّا کے کوئی خاں صاحب یا خان بہادر کی قسم کے عزیز دوست ایک مہینے سے پہاڑ پر جا چکے تھے۔ وہاں تار بھیجا گیا اور انہوں نے مجھے بلا لیا۔ گھر میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میری ہم عمر ایک لڑکی بھی ہے۔ اس پر میرے کان کھڑے ہوئے، چنانچہ تقریباً سارے گرم سوٹ ڈرائی کلین کرانے کے لیے دے دیئے گئے۔ لیکن پھر پتہ چلا کہ وہ فلسفہ پڑھتی ہے اور عینک لگاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ، چلو اس کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ اب مزے سے پڑھیں گے۔ لیکن عجیب الجھن سی پیدا ہو گئی۔ فلسفی لڑکی! اس پر طُرّہ یہ کہ عینک لگاتی ہے۔

میں وہاں پہنچا۔ ایک صاحب مجھے لینے آئے۔ میری عمر کے ہوں گے۔ بولے۔ ”میں ہوں توفیق لیکن مجھے رفّو کیا جاتا ہے۔“

ان کے مکان تک آٹھ دس میل کی چڑھائی تھی۔ وہ کار میں آئے تھے، لیکن ہم نے کار واپس بھیج دی کہ مزے مزے سے پیدل چلیں گے۔ راستے میں خوب باتیں ہوئیں۔ پتہ چلا کہ وہ بھی کسی امتحان کے پھیر میں ہیں۔ وہ خان صاحب (یا خان بہادر) کے کچھ چچا کے ماموں کی بھتیجی کی خالہ کے پوتے کے چچازاد بھائی کی قسم کے عزیز تھے۔ کافی دیر حساب لگانے کے بعد پتہ چلا کہ وہ تقریباً ان کے بھتیجے تھے۔ پھر ان فلاسفر صاحبہ کا ذکر ہوا۔ شکیلہ نام تھا۔ ہم دونوں سے عمر میں دو تین سال بڑی تھیں اور فلسفے کی کوئی بڑی ساری ڈگری لینے کی فکر میں تھیں۔

چلتے چلتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ رفّو ہاتھ سے اشارہ کرکے بولے۔ "بس یہ موڑ اور رہ گیا ہے۔"

سامنے بادل ہی بادل چھائے ہوئے تھے۔ آگے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ رفّو بولے۔ "ایک عجیب بات ہے۔ اس موڑ پر ہمیشہ یا تو بادل ہوتے ہیں یا دُھند!" اب ہم دھند میں سے گزر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ دُھند صاف ہوئی تو موڑ کے بعد ان کی کوٹھی یکلخت سامنے نظر آنے لگی۔ بس ایک گہرا سا کھڈ اتھا بیچ میں لیکن ابھی آدھ میل کا چکر اور تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کوٹھی کے قریب درختوں کے جھنڈ میں

ایک پتھر پر کوئی خاتون کھڑی تھیں۔ چھریرا قد، لہراتے ہوئے پریشان بال، ہلکا گلابی چہرہ اور ناک پر کالے فریم کی ایک عینک۔

"یہی ہیں شکیلہ۔" رفّو بولے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ اتنی بری نہیں تھیں۔ جتنا میں سمجھے بیٹھا تھا۔ اگر یہ موٹی سی عینک نہ ہوتی تو شاید حسین کہہ سکتے تھے۔۔۔ یا کم از کم وہ بھدا سا سیاہ فریم نہ ہوتا۔

میں کُنبے میں بہت جلد گھل مل گیا۔ رفّو اور میں تو بالکل بے تکلّف ہو گئے، لیکن شکیلہ تھیں کہ لی ہی نہیں پڑتی تھیں۔ نہ کبھی ہماری باتوں میں دلچسپی لیتیں نہ کبھی گفتگو میں شریک ہوتیں۔ ہم دونوں ان کے سامنے بہتیرے ٹامک ٹوئیے مارتے، اول جلول باتیں کرتے، خوشامدیں کرتے لیکن ان کی ناک ہمیشہ چڑھی رہتی۔ اور ان کا کام کیا تھا؟ صبح سے شام تک دس دس سیر وزنی کتابیں پڑھنا۔

رات کو انگیٹھی کے سامنے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اتنی سنجیدگی سے جیسے دنیا کے نظام کا دارومدار ان ہی کی سوچ بچار پر تو ہے۔ کبھی انگلی سے ہوا میں لکھنے لگتی ہیں۔ کبھی کرسی پر طبلہ بجنے لگتا ہے۔ کبھی جھنجلا جھنجلا پڑتی ہیں۔ پھر یکلخت ایک مُسکراہٹ لبوں پر دوڑ جاتی ہے اور سر ہلنے لگتا ہے جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔

دفعتاً مٹھیاں بھینچ لی جاتی ہیں اور غریب صوفے کے دو تین مکّے رسید کیے جاتے ہیں۔ اِدھر ہم انہیں دیکھ کر جھنجلا اُٹھتے۔ یہ تو نیم پاگل ہیں بالکل۔

خان صاحب (یا خان بہادر) اور بیگم صاحبہ کا معاملہ ہی اور تھا۔ وہ ہمیشہ باتیں سیاسیات، معاشیات، فسادیات وغیرہ کی کرتے جن میں ہمیں ذرہ بھر بھی دلچسپی نہ ہوتی۔ باقی تھے بچّے، وہ پہلے ہی سے احمق تھے یا خاص طور پر احمق بنادیئے گئے تھے۔ اب بھلا ہم کس سے باتیں کرتے؟ لے دے کے یہی ایک ہم عمر تھیں۔ وہ بے حد تنہائی پسند اور خشک مزاج واقع ہوئی تھیں اور ماشاء اللہ اپنی ہی دنیا میں بستی تھیں۔

کبھی منّت سے کہا۔ "ہمارے ساتھ بیڈ منٹن کھیل لیجئے۔" جواب ملا۔ "عینک ہے! عینک پر چڑیا لگے گی۔"

کہا۔ "نہیں! ہم نہیں لگنے دیں گے۔ شاٹ نہیں ماریں گے۔ بس اُچھال اُچھال کر کھیلیں گے۔"

کہنے لگیں۔ "تو پھر وہ کھیل ہی کیا ہوا جو بے دِلی سے کھیلا جائے۔ ویسے آپ دونوں تو سنگلز بھی کھیل سکتے ہیں، بھلا میں تیسری کیا کروں گی؟"

پھر کسی دن کہا۔۔۔۔ ہمارے ساتھ سیر کو چلیے۔ بولیں ”ابھی تو مجھے فرصت نہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔ جب تک مَیں یہ تھیوری نہیں سمجھ لیتی۔“

پوچھا۔ ”تو کب تک سمجھ لیں گی آپ یہ تھیوری۔“

جواب ملا۔ ”کیا پتہ۔ شاید پانچ منٹ میں سمجھ لوں اور سمجھ میں نہ آئے تو مہینے تک نہ آئے۔“

اور جو کسی دن بہت خوش ہوتیں تو کہتیں۔ ”بس ابھی چلتے ہیں سیر کو۔ ذرا بچّوں سے کہہ دیجیے کہ تیار ہو جائیں۔“

بچّوں کے نام پر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور بات وہیں ختم ہو جاتی۔ عموماً میں اور رفّو دونوں سیر کو جایا کرتے۔

کُچھ دنوں تک تو یونہی ہوتا رہا۔ پھر ایک دن ہم نے تنگ آکر بغاوت کر دی۔ آخر کیوں نہیں شریک ہوتیں یہ ہمارے ساتھ۔ جب ایک ہم عمر موجود ہے تو پھر اس کی رفاقت سے کیوں محروم رہیں؟

پہلے تو طے ہوا کہ ایک رات چپکے سے ان کی ساری کتابیں جلا دی جائیں یا کسی ندی میں پھینک دی جائیں۔ پھر سوچا کہ ایک دو ہفتے تک اور کتابیں آ جائیں گی۔ کافی

سوچ بچار کے بعد ایک تجویز رفّو کے دماغ میں آئی۔ بولے۔ ”تو تمھیں سزا ہی دینی ہے نا انہیں؟“

”یقیناً“ میں نے سر ہلا کر کہا۔

”تو کیوں نہ ان سے محبّت کی جائے؟“ وہ میرے کان میں بولے۔

آہاہاہا! کتنی اچھی تجویز تھی۔ محبّت کے آگے تو بھوت بھی ناچتے ہیں، اور یہ تو ہیں محض فلاسفر! ہم دونوں نے ہاتھ ملائے۔ یہ بہترین تجویز تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ محبّت کون کرے؟ ہم میں سے کوئی بھی اس ذمہ داری کو سر لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایسی ویسی محبّت ہوتی تو کر بھی لیتے۔ فلاسفر سے محبّت کرنی تھی معاملہ خطرناک تھا۔

مَیں نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”بھئی اب تم ہی کر لو۔“ کیونکہ وہ ذرا دبلے پتلے سے تھے اور ان کی صحت محبّت کرنے کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ وہ تقریباً گڑگڑا کر بولے۔ ”نہیں نہیں! مجھے معاف کر دو تو بہتر ہو گا۔ اوّل تو میں نے ابھی تک کچھ پڑھا نہیں اور دوسرے یہ کہ مجھے زکام سا رہتا ہے ہر وقت۔ پھر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مجھے عینک سے بھی ڈر لگتا ہے!“

مَیں نے بھی بڑے بڑے بہانے پیش کیے مگر ایک نہ چلی۔ آخری فیصلہ ہوا کہ میں اسی اتوار سے محبّت شروع کر دوں۔ اس کے لیے پروگرام بنایا جائے اور ریہرسل بھی باقاعدہ کیے جائیں۔

اگلے دن ایک چھوٹا سا انگریزی کا افسانہ شکیلہ کو سُنانے گیا۔ پہلے تو وہ سُنتی ہی نہ تھیں۔ بڑی مشکل سے انہوں نے مجھے دس منٹ دیئے۔ میں نے افسانہ شروع کیا کہ کسی طرح چلتی ریل میں سے ایک لڑکی دریا میں گر پڑی جو نیچے بہہ رہا تھا۔ پُل کے نیچے ہیرو نے جو کشتی چلا رہا تھا، لپک کر لڑکی کو کرکٹ کی گیند کی طرح کیچ کر لیا اور چیخ کر بولا۔ "ہاؤ از اِٹ" ریل کے گارڈ نے جو خوش قسمتی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، امپائر کی طرح انگلی اٹھائی اور چلا کر کہا۔۔۔ "آؤٹ!" پھر ہیرو اور ہیروئن کی آنکھیں چار ہوئیں؟

"آنکھیں چار ہوئیں؟" انہوں نے چونک کر پوچھا۔

"جی نہیں! معاف کیجئے۔۔۔ آنکھیں چھ ہوئیں!" میں نے ان کی عینک کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور اگر ہیرو نے بھی کہیں چشمہ لگا رکھا ہو تو پھر آنکھیں آٹھ ہوئیں۔ اور نگاہیں شیشوں کو پار کر کے ایک دوسرے سے لڑ گئیں۔۔ اور۔۔۔۔!"

"تم ہو نہی فضول باتیں کرتے ہو۔" وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ "جاؤ ہم نہیں سُنتے!"

سہ پہر کو کوٹھی کے پرے ایک چھوٹے سے جھرنے کے پاس بیٹھی فلسفے کی ایک فربہ اور تندرست کتاب پڑھ رہی تھیں۔ عینک اتار رکھی تھی۔ میں بھی ایک مریل سی کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ بدستور چپ بیٹھی رہیں۔

مَیں نے دُور ننھی سی جھیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "واہ واہ! کیا نظارہ ہے۔ جھیل کا پانی یوں چمک رہا ہے۔ جیسے چاندی کا۔۔۔ چاندی کا شیشہ! اور اس پر اُجلی اُجلی مُرغابیوں کا عکس کیا بھلا لگتا ہے۔"

"کیا؟" انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ عینک کے لیے جو غالباً وہاں نہیں تھی۔

"آہاہاہا۔ ہاہا!" میں نے پھر کہا۔

"تو خوبصورت نظارہ ہے۔۔۔ اچھا۔۔۔" وہ کوٹ کی جیبیں تلاش کر رہی تھیں۔ "ابھی دیکھتی ہوں۔۔۔ یہ کمبخت عینک کہاں غارت ہو گئی؟ تو گویا مُرغابیاں بھی ہیں۔۔۔ اچھا!"

وہ بدستور عینک ڈھونڈ رہی تھیں۔ "اُفّوہ! وہاں رہ گئی!" انہوں نے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا۔ "ذرا لا دیجیے گا وہاں سے!"

میں عینک لے آیا۔ انہوں نے صاف کر کے لگائی۔ ”بہت خوب! بہت اچھا نظارہ ہے!۔۔۔ لیکن وہ مُرغابیاں کہاں ہیں؟“

”بھلا وہ آپ کی عینک کا انتظار کرتیں کبھی کی اُڑ گئیں۔“ دراصل وہاں مُرغابیاں تھیں ہی نہیں!

”اچھا تو اُڑ گئیں۔۔۔ پھر دیکھ لیں گے کبھی۔۔۔“ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔

اگلے روز میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”ذرا آج میرے ساتھ سیر کو چلیں گی؟“

بولیں۔ ”کیوں آج کوئی خاص بات ہے؟“

”جی نہیں! دراصل میں نے ایک نیا راستہ دیکھا ہے جو پہاڑ کی طرف دوسری طرف لہراتا ہوا اترتا ہے۔ وہاں اتنے دلفریب نظارے ہیں کہ کیا بتاؤں۔۔۔ اس طرف چلیں گے!“

”ایک تو تمہارے ان دلفریب نظاروں نے عاجز کر دیا ہے۔ خیر!“ وہ سوچنے لگیں۔ ”تو گویا نیا راستہ ہے، نظارے بھی ہیں۔۔۔ اور وہ بھی دلفریب۔۔۔ اچھا چلتے ہیں!“

اب اگلا سوال ان کا بچوں کے متعلق تھا۔ میں نے جلدی سے پیش بندی کر دی۔
”پتہ نہیں یہ بچے کہاں چلے گئے؟ بڑی دیر تلاش کی لیکن ایک بھی تو نہیں ملا۔“

اسی دوپہر کو مَیں نے ان کی عینک کہیں چھپا دی تھی۔ چنانچہ وہ بغیر عینک کے تھیں۔ جو راستہ پہاڑ کے دوسری طرف اتر تا تھا، وہ بالکل خشک تھا۔ ہم دونوں کالے کالے پتھروں اور کانٹے دار جھاڑیوں میں سے گزر رہے تھے۔ ”ذرا دیکھئے تو کیسے رنگ رنگ کے پھول کھلے ہیں۔ تختے کے تختے دُور دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ جیسے قالین بچھے ہوں!“ میں نے چند اکٹھے ہوئے درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

”کہاں ہیں؟ اس طرف۔۔۔ ہاں!۔۔۔ بڑے پیارے پھول ہیں! اتنا تو مجھے عینک کے بغیر بھی نظر آ جاتا ہے!“ وہ اپنی کمزوری چھپا رہی تھی۔

”اور یہ اس طرف تو آپ نے دیکھا ہی نہیں۔ اس وقت کیمرہ ہوتا تو تصویر لیتے۔ ایک پتلی سی جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آبشار ہے پہاڑ کی چوٹی پر۔ موتیوں جیسے چمکیلے قطرے پتھروں پر ناچ رہے ہیں۔“ میں نے ایک سوکھے ہوئے پہاڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت پیاری آبشار ہے اور آواز بھی تو بڑی مدھم اور بھلی ہے؟" یہ آواز انھوں نے خوامخواہ سُننا شروع کر دی۔

"ارے!" میں جیسے چونک کر بولا۔ "یہ قوسِ قزح! یہ قوسِ قزح اس پہاڑی سے اس پہاڑی تک چلی گئی ہے۔ ایک چھوٹا سا پُل بن گیا ہے!"

"اور پھر رنگ کیسے نمایاں ہیں۔ خاص طور پر وہ سبز رنگ! کل میں ضرور یہاں عینک لگا کر آؤں گی تا کہ ذرا اچھی طرح۔۔۔ نہیں، نہیں۔۔۔ بس یونہی عینک لگاؤں گی۔ اور اگر نہ بھی لگاؤں گی تو کونسا فرق پڑتا ہے۔ ویسے اب بھی سب کچھ نظر آرہا ہے!"

اور دوسرے روز وہ عینک لگا کر اکیلی ہی اسی راستے سے گئیں۔ جب واپس آئیں تو بُرا سا مُنہ بنا ہوا تھا اور مجھ سے دو تین دن تک بات نہ کی۔

اتوار کی صبح آئی، جب سے مجھے محبّت شروع کرنی تھی۔ سارا دن موقع نہ ملا۔ رات ہوئی اور چاندنی کھلی۔ پہاڑوں کا چمکیلا چاند تاباں تھا۔ میں ان کے کمرے میں گیا۔ کچھ دیر تمہید باندھی۔ چاندنی رات کی رومانی فضا کی تعریفیں کیں، فوائد بتائے۔ پھر کہا۔ "کاش اس وقت میرے ساتھ چلتیں۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں۔ پھر پنسل سے ناک کھجا کر بولیں۔ ”آپ نے ایک بے معنی سی بات کہی ہے، بالکل بے معنی فقروں میں۔ آپ چاہتے کیا ہیں؟ چاندنی رات کی سیر یا مجھ سے باتیں کرنا؟ اگر سیر کرنی ہے تو اکیلے پھرنا بہتر ہو گا۔ کیونکہ جہاں تک چاندنی رات کی لطافت اور رومانیت کا تعلّق ہے وہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ اگر میں ساتھ ہوئی تو آپ کبھی مجھ سے باتیں کریں گے اور کبھی فضا کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں تو میرے پاس بیس منٹ سے زیادہ فالتو وقت نہیں۔ اس دوران میں آپ جلدی سے باتیں کر لیجیے اور پھر خواہ چاندنی میں پھریئے یا اندھیرے میں۔۔۔!“

میں مُنہ بنائے چلا آیا۔ بسم اللہ ہی غلط نکلی۔

پھر ایک دفعہ میں نے ان کی انگلیاں چھو کر کہا۔ ”کتنی پیاری انگلیاں ہیں؟“

”آپ کا فقرہ سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ انگلیاں ہیں ہی پیاری؟ یا صرف آپ کو پیاری لگتی ہیں؟“

”مجھے پیاری لگتی ہیں!“ میں ذرا سہم کر بولا۔

"بھلا پیاری لگنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ایک لمبی سی پتلی چیز، اُوپر معمولی کھال، نیچے گوشت اور ہڈی۔۔۔ بس! سب کی انگلیاں اسی قسم اور بالکل اسی بناوٹ کی ہوتی ہیں۔ آپ انہیں بھی تو پیاری کہہ سکتے ہیں!"

مَیں جھلّا اُٹھا۔۔۔ بات بات میں فلسفہ! کیا مصیبت ہے؟ رفّو سے مشورہ لیا گیا۔ وہ بولے۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آج ایک چھوٹی سی تقریر لکھ دوں گا اور تمہیں خوب مشق کرا دوں گا۔ میں کالج میں کئی ڈرامے کر چکا ہوں۔"

پورا ایک دن ریہرسل میں ضائع ہو گیا۔

میں نے انہیں باغ میں جا پکڑا۔ وہ بدستور اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کر دی اور گھڑی دیکھنے لگیں جیسے کہنا چاہتی ہوں کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرو گے اب۔ مَیں نے تقریر شروع کی کہ کس طرح کوئی کسی کے دل میں آ کر بس جاتا ہے اور پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا۔۔۔۔ ہر دم اس کا خیال ستانے لگتا ہے۔

"خوب! تو یوں بھی ہو جاتا ہے کبھی؟" وہ مُسکرا کر بولیں۔

"جی ہاں! کئی مرتبہ ہوا۔ ہوتا رہا ہے۔ ہوا کرتا ہے۔ ہوا کرے گا۔۔۔ اور۔۔۔ ابھی ابھی ہوا ہے!"

"مثلاً"

"مثلاً یہی کہ مجھے (دلیر بن کر) یعنی میرے دل میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے!" میں جرأت کر کے کہہ گیا، لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور مُسکرا رہی تھیں۔

"غلط! بالکل غلط! دل میں کسی کا خیال نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں، وہ اعصابی نظام کے توسط سے دماغ میں جاتا ہے۔ جب ہم سوچتے ہیں تو دماغ میں سوچتے ہیں۔ دل کا سوچنے سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ دل میں خیال ویال کے لیے کوئی جگہ ہے۔ وہاں تو بمشکل خون سما سکتا ہے!"

"اچھا تو یونہی سہی کہ دماغ میں ہر وقت آپ کا خیال رہتا ہے!"

"اگر یہ صحیح ہے تو یہ آپ کی دماغی کمزوری ہے کہ ایک معمولی سی چیز کا اثر دماغ کے مختلف حصوں پر اس قدر حاوی ہو جائے کہ کسی وقت پیچھا نہ چھوڑے!"

"کمزوری ہی سہی، لیکن مجھے ہر وقت۔۔۔۔"

''آپ یہاں ہر وقت نہیں کہہ سکتے ہیں، کیوں جب آپ سوتے ہوں گے تو یقیناً بھول جاتے ہوں گے، لہٰذا آپ نیند کے گھنٹوں کو چوبیس گھنٹوں سے نکال کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مجھے اتنے گھنٹے آپ کا خیال رہتا ہے، مگر یہ بھی اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آپ سارا دن ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور ایک ہی بات سوچتے رہیں۔''

''خیر کچھ بھی ہو!'' میں نے جھلّا کر کہا۔ (مَیں تقریر کے الفاظ بھولتا جارہا تھا۔) ''مَیں سوچتا ہوں، خواہ دِل میں سوچوں یا دماغ میں یا جگر میں۔ دن بھر سوچوں یا رات بھر۔ مگر میں سوچتا ہوں اور خوب سوچوں گا، کبھی باز نہیں آؤں گا۔ آپ کی فلاسفی مجھے متاثر نہیں کر سکتی۔ میں آپ کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں نہ جانے کیا کیا کر بیٹھوں۔ (مَیں پھر بھول گیا) آپ چاہیں تو سر کے بل اس ندی میں چھلانگ لگا دوں، اور (پُرجوش لہجے میں) آپ چاہیں تو یہ بھاری پتھر وہاں رکھ آؤں اور (ذرا بلند آواز سے) اگر آپ کہیں تو اس پودے کو جڑ سے اکھیڑ دوں اور۔۔۔!''

''پھر آپ کی دماغی کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے جو درخت اکھڑواتی پھروں یا پتھروں کو ان کی جگہ سے ہلواؤں۔ ایسے خیالات محض آپ

کے دماغ کی اختراع ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات تندرست دماغ میں کبھی نہیں آسکتے۔"

انہوں نے اپنی عینک اتار دی اور صاف کرنے لگیں۔ میں تقریباً ساری تقریر بھول چکا تھا۔ یکایک مجھے ایک دورہ سا اٹھا۔

"دیکھئے اگر آپ چاہیں تو میں پل بھر میں عینک کے شیشے صاف کر سکتا ہوں یا اس عینک کو توڑ کر ایک نئ عینک لا سکتا ہوں۔"

"چچ چچ۔۔۔ اُفّوہ! دماغی کمزوری کے مزید ثبوت مل رہے ہیں۔ عینک کے شیشے صاف کرنا ایک معمولی سا کام ہے، اور پھر ایک ثابت چیز ضائع کر کے ویسی ہی نئ لانے میں کہاں کی عقلمندی ہے؟ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ اس وقت آپ کے دماغ میں کسی عجیب جذبے کے تحت عجیب سا طوفان بپا ہے۔"

اور میں نے رفّو سے آکر کہہ دیا کہ "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا، قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ بات بات میں مین میخ نکلتی ہے۔ ایک ایک فقرے کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ بات کچھ کرنے جاؤ اور سُن کے آؤ کچھ! میں ان فلاسفر صاحبہ سے کبھی نہیں جیت سکتا۔"

مگر رفّو تھے کہ برابر کہہ رہے تھے۔ ’’گھبراؤ مت! آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائیگا۔‘‘ ایک تو ان کی اس آہستہ آہستہ نے مار رکھا تھا۔ جب جا کر شکایت کرو، یہی جواب ملتا کہ آہستہ آہستہ سب درست ہو جائے گا۔ دراصل ناامید وہ بھی ہو چلے تھے۔

رفّو کے بار بار مجبور کرنے پر میں ہر روز دو چار باتیں شکیلہ سے ایک کر جاتا جن پر دیر تک فلسفے کے لیکچر سُننے پڑتے۔ مگر ایک تبدیلی ان میں آتی جا رہی تھی۔ پریشان بال اب سنوارے جاتے تھے۔ کپڑوں کا خاص خیال رکھا جاتا۔ عینک بھی بدل دی گئی۔ اب بغیر فریم کی نازک سی عینک آ گئی تھی جس سے چہرہ بہتر معلوم ہوتا تھا مگر ان کی باتیں بدستور ویسی ہی تھیں۔

آخر ایک دن میں نے پھر ہمّت کی اور سر پر کفن باندھ کر اظہارِ محبّت کے لیے تیار ہو گیا۔ جو کچھ ہو گا دیکھا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک ڈانٹ مل جائے گی۔ بڑی محنت اور مختلف کتابوں کی مدد سے ایک رومانی تقریر تیار کی گئی۔ اسے خوب رٹ کر آخری حملے کے لیے تیار ہو گیا۔ اظہار کے لیے شام کا دلفریب وقت چنا گیا۔ جب شفق سے سارا آسمان جگمگا رہا ہو اور ٹھنڈی معطّر ہوا کے جھونکوں سے شکیلہ کے بال لہرا رہے ہوں۔

پہلے دن تو شام کو بارش ہو گئی، اس لیے سب کچھ ملتوی کرنا پڑا۔ دوسرے دن صبح سے رفّو نے مجھے طرح طرح کی چیزیں لا کر دیں۔ اتنی کہ میں پیتے پیتے تنگ آ گیا۔ ہارلکس کا دودھ، سیناٹوجن، لوہے کا ٹانک، چند چمچے مچھلی کا تیل، دوپہر کو ماء اللحم پلایا گیا۔ سارا دن وہ مجھے تسلّی دیتے رہے کہ شاباش گھبرانا مت، معمولی سی بات ہے اور پھر کوئی روز روز تو نہیں کرنی ہو گی۔ خیر شام ہوئی۔ میں نے شکیلہ کو حسبِ معمول باغ میں ایک پتھر پر پڑھتے پایا۔ بغیر کسی تمہید کے میں نے تقریر شروع کر دی۔

''آج کی باتیں شاید آپ کو بُری لگیں۔ اگر لگتی ہیں تو لگا کریں، لیکن میں کہوں گا اور ضرور کروں گا۔'' میں ایک گھُٹنے کے بل جھکا اور داہنا ہاتھ بڑھا کر بولا۔

''آپ نہیں جانتیں کہ میری زندگی کس قدر اداس اور تنہا ہے۔ (انہوں نے نفی میں سر ہلایا جیسے کہتی ہوں کہ نہیں جانتی۔) میں اندھیرے میں بھٹکتا رہا ہوں۔ میں نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں، لیکن اب زندگی کے اس بے پایاں سمندر میں میری تنہا کشتی کا کوئی بادبان بن گیا۔ تاریک افق پر ایک روشن ستارہ طلوع ہوا۔۔۔ اور۔۔۔!''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے!'' وہ پنسل کو بالوں میں پھیرتی ہوئی بولیں۔

"اور۔۔۔ اور میرے مُرجھائے ہوئے پژمردہ دل میں!"

"غالباً مُرجھائے ہوئے اور پژمردہ کا ایک ہی مطلب ہے۔ ہے نا؟ بہتر ہوتا ہے آپ ان میں سے فقط ایک استعمال کرتے!"

"اچھا! چلیے پژمردہ سہی۔۔۔ تو میرے پژمردہ دِل میں پھر زندہ رہنے کی تمنّا پیدا ہو گی؟"

"یہ کب کا ذکر ہے؟"

"ابھی کا ذکر ہے۔ حال ہی کا!" مَیں نے جلدی سے کہا۔ (مجھے ڈر تھا کہ کہیں یاد کیے ہوئے فقرے بھول نہ جاؤں۔) "جی! اور یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہو!"

"یہ آپ کس سے کہہ رہے ہیں؟"

"آپ سے کہہ رہا ہوں، لاحول ولا قوۃ! آپ سُنتی رہیے۔ ٹوکیے مت!۔۔۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا بھلا؟"

"جیسے آپ نے کسی کا ہاتھ تھام لیا ہو؟" انہوں نے لقمہ دیا۔

”شکریہ! میں نے نہیں بلکہ کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہو۔ اور میں بھٹکتے بھٹکتے پھر راستے پر آ گیا ہوں۔“

”لیکن جہاں آپ بھٹک رہے تھے اسے بھی تو ہم راستہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ راستہ وہ جگہ ہے جہاں سے گزرا جائے۔ بھٹکنے وٹکنے کی کوئی شرط نہیں ہے بیچ میں۔ آپ کا فقرہ غلط ہے۔ یوں کہیے کہ آپ بھٹکتے بھٹکتے راہِ راست پر آ گئے ہیں!“

”خیر! یوں ہی سہی۔ میں راہِ راست پر آ گیا ہوں اور اب میری زندگی۔۔۔“

”مگر وہ ہے کون جس نے یہ سب حرکتیں آپ کے ساتھ کی ہیں؟“

”نہیں بتاتے۔“ میں نے بچّوں کی طرح مُنہ بنا کر کہا۔

”ہم تو ضرور سُنیں گے کہ وہ کون ہے؟“ وہ بولیں۔

”وہ کون ہیں؟۔۔۔ آپ سچ مچ نہیں جانتیں کیا؟ وہ یہاں ہیں۔ (مَیں نے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ یہاں بستی ہیں۔۔۔ نہیں نہیں، میرا مطلب ہے کہ (سر پکڑ کر) یہاں بستی ہیں!“

”کُچھ اتا پتا بھی تو معلوم ہو ان کا!“

مَیں گھبرا گیا۔ دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا، حلق خشک تھا۔ مَیں نے سو گز کی دوڑ کی تیاری کی اور چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ”وہ۔۔۔ آپ۔۔۔ ہیں!“ اور قلانچ مار کر بھاگا۔ کچھ دور جا کر مجھے چند الفاظ یاد آ گئے جنہیں بھول گیا تھا۔ بھاگتے بھاگتے رُک گیا اور پیچھے مُڑ کر زور سے بولا۔ ”ذرا سُن لیجیے۔ آپ بالکل شگفتہ درخت۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ شگفتہ پودے کی طرح لگتی ہیں۔ آپ کا چہرہ گلاب کے پتّے کی طرح، یعنی پھول کی طرح ہے۔۔۔ اور۔۔۔ میں آپ کے لیے تحفہ لاؤں گا۔ یعنی آپ میرے لیے تحفہ لائیں گی۔ یعنی کہ انگوٹھی۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔“ آگے تو بالکل بھول گیا۔

واپس آتے ہی میرے سر میں سخت درد شروع ہو گیا۔ نہ جانے دن میں رفّو نے کیا کیا الا بلا کھلا دی تھی۔ اس کا نتیجہ شدید درد نکلا۔ کمبخت اسپرین وغیرہ سے بھی قابو میں نہ آیا۔ رات کے گیارہ بجے تھے۔ سب کے سب میری مزاج پُرسی کر کے جا چکے تھے۔ رفّو کو ان کے کسی دوست نے باہر مدعو کر رکھا تھا۔ میں کمرے میں اکیلا بیٹھا کھڑکی سے پہاڑ کی چوٹی کو دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے اُجلی اُجلی روشنی شاہد تھی کہ ابھی چاند نکلے گا۔ یکایک دروازہ کھلا۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک خوبصورت سا کوٹ پہنے شکیلہ داخل

ہوئیں اور میرے سر میں دُگنا درد شروع ہو گیا۔ اب یہ خوب دھمکائیں گی۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور دبک گیا۔ لیکن انہوں نے دھمکایا نہیں، چپکے سے سرہانے بیٹھ گئیں اور ملائم ہاتھوں سے سر کو آہستہ آہستہ دبانے لگیں۔ مَیں نے سوچا کہ یہ تمہید باندھی جارہی ہے۔ یہی ملائم ہاتھ ذرا سی دیر میں کانوں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ذرا آنکھ کھولی تو شامت آجائے گی۔

انہوں نے میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ ”کیا واقعی بہت درد ہے؟“

میں نے ڈرتے ڈرتے دیکھا۔

وہ مُسکرا کر بولیں۔ ”شریر کہیں کے۔ اب بھگتو شرارتوں کے نتیجے!“ انہوں نے چپکے سے میری ہتھیلی پر کوئی چیز رکھ دی۔ ایک انگوٹھی ہلکی پھلکی سی۔ میں چونک پڑا۔

”مگر۔۔۔ یہ انگوٹھی۔۔۔ ذراوہ۔۔۔!“ میں انہیں واپس دینے لگا۔

”چپ!“ وہ میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولیں۔ ”جب سر میں درد ہو تو بولا نہیں کرتے۔“

مَیں چُپ ہو گیا۔ وہ بدستور بیٹھی سر دباتی رہیں۔ چاند نکل آیا تھا۔ کچھ شعاعیں کھڑکی میں سے گزرتی ہوئی ان کے چہرے سے کھیلے لگیں۔ ان کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ میں نے کَن انکھیوں سے دیکھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ شیشوں کا چمکارا ہو گا۔ میں نے دل میں سوچا اور جب وہ شب بخیر کہہ کر چلی گئیں تو دفعتہً یوں لگا جیسے سر کا درد جو کچھ دیر کے لیے غائب ہو چکا تھا، پھر شروع ہو گیا۔ دیر تک میں انگوٹھی کے سفید جگمگاتے ہوئے نگ کو دیکھتا رہا۔

اگلے روز صبح صبح گھر سے تار آ گیا۔ ایک مہربان پروفیسر صاحب نے مجھے دو ہفتے پہلے واپس آنے کی تاکید کی تھی۔ امتحان کی تیاری کے لیے! شام تک سامان باندھنا پڑا۔ دوسرے دن جاتا تھا۔ اگلی صبح میں اور رفّو پیدل روانہ ہوئے۔ نیچے اترتی ہوئی سڑک مُڑتی دوبارہ کوٹھی کے بالکل پاس سے گزرتی تھی۔ ابھی ہم اس موڑ سے ذرا دور تھے جہاں سے ان کا باغ بالکل سامنے آ جاتا تھا۔

مَیں یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں میری باتوں پر وہ برا نہ مان گئی ہوں۔ مگر ان کے خشک فلسفی دماغ پر کیا اثر ہوا ہو گا لیکن بغیر فریم کی عینک۔۔۔ وہ خوشنما ملبوس۔۔۔ اور انگوٹھی کا تحفہ۔۔۔ کیا ان کا مطلب کچھ نہیں؟ نہیں!۔۔۔

غالباً کوئی مطلب نہیں!

"مجھے تو ہر دم یہی ڈر رہتا تھا کہ کہیں ہمیں دھمکایا نہ جائے۔ بعض اوقات تو ہم نے بہت زیادتی کی۔۔۔!" رفّو کہنے لگے۔

مَیں چونک پڑا۔ "ایں۔۔۔ کیا۔۔۔؟"

"اور پھر جس دن تمہیں اظہارِ محبّت کرنا تھا، اس روز تو میں بہت ڈرا۔ یہ فلاسفی بھی عجیب مصیبت ہے۔ اگر شکیلہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو یا تو اچھی طرح تمہارے کان کھینچتی یا تم سے محبّت کرنے لگتی۔۔۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔"

"بس خیریت رہی کہ کان نہیں مروڑے گئے!"

"مگر۔۔۔ کچھ اندیشہ سا ہے میرے دل میں۔" وہ سوچ کر بولے۔ "اور جو انہیں تم سے محبّت ہو گئی ہو تو؟"

"ہشت! محبّت اور انہیں؟ بھلا فلاسفر بھی محبّت کرتے ہیں کہیں؟ اور پھر عینک والے فلاسفر!"

ہم دونوں ہنس دیئے، انہوں نے جیب سے اخبار نکالا اور پڑھنے لگے۔

ہم دونوں اسی موڑ سے گزر رہے تھے۔ سامنے ان کا باغ تھا۔۔ بالکل نزدیک۔ بس بیچ میں ایک کھڈ تھا۔

یکایک میری نگاہ سامنے کے پتھر پر گئی جہاں شکیلہ کھڑی تھی۔ ان کا گلابی چہرہ پھول کی طرح چمک رہا تھا۔ بغیر فریم کی عینک کے شیشوں سے دو بڑی بڑی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ وہ کتنی اچھی دکھائی دے رہی تھیں۔

رفّو بدستور اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے شکیلہ کو سلام کیا۔ انہوں نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ نہ جانے ان کے چہرے پر اتنی افسردگی کیوں تھی۔ شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔

کہیں یہ آنسو تو نہیں؟۔۔ نہیں! ویسے ہی شیشوں کا چمکارا ہو گا۔۔ یونہی دھوکا ہوا۔۔۔

اب ہم موڑ کو طے کر رہے تھے۔ دھند بڑھتی جا رہی تھی۔ دو چار اُجلے اُجلے بادلوں کے کے ٹکڑے ہماری طرف بھاگے آ رہے تھے۔ میں شکیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

دُھند بڑھتی گئی۔ بادل کے ٹکڑے ہمارے سامنے آ گئے اور سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا تھا؟" رفّو چونک کر بولے۔

"کُچھ نہیں!"

پھر راستے میں ہم نے قوسِ قزح دیکھی جو نیچے وادی میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چلی گئی تھی۔ بادلوں سے چند شعاعیں جھانکنے لگیں اور قوسِ قزح میں بے شمار پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ ہم ایک آبشار کے پاس سے گزرے، پانی کی پھوار دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پتھروں پر ہم نے ننھے مُنّے قطرے دیکھے جو بڑی مسرت سے ناچ رہے تھے۔

ایک تنگ راستے سے گزرتے ہوئے میری کہنی ایک جنگلی گلاب کو چھُو گئی۔ ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔ ٹپ۔۔۔! شبنم کے چند قطرے میری آستین پر آ کر گرے۔ مَیں نے قطروں کو کوٹ سے جھاڑا نہیں، یونہی رہنے دیا۔ پھر میری نگاہ انگلی کی انگوٹھی پر جا پڑی جو شکیلہ نے مجھے دی تھی۔ جگمگ جگمگ کرتا ہوا

سفید رنگ۔۔۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی آنسو جم گیا ہو۔ رنگ کی جھلملاہٹ میں آنسو کی لرزش دکھائی دی۔ مَیں نے جلدی سے ہاتھ جیبوں میں ڈال لیے۔

شاید رفّو کا اخبار ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے پھر باتیں شروع کر دیں۔

سماج

بچپن میں بھوتوں پریتوں کی فرضی کہانیاں سننے کے بعد جب سچ مچ کی کہانیاں پڑھیں تو ان میں عموماً ایک مشکل سا لفظ آیا کرتا۔ سب کچھ سمجھ میں آجاتا لیکن وہ لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ دن اور آج کا دن، اس لفظ کا پتہ ہی نہ چل سکا۔

وہ لفظ ہے "سماج۔" یوں تو یہ لفظ آسان سا ہے، اس کے معنی برادری یا معاشرہ وغیرہ ہوں گے لیکن پتہ نہیں اس جماعت کے لوگ بستے کہاں ہیں اور کیوں بات بات پر اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کو کچھ کرنے نہیں دیتے، کسی کو آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ نہ جانے اس جماعت کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اور یہ لوگ کیوں سکون کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ہوش سنبھالتے ہی یہ سُننے میں آیا۔ ظالم سماج، خوفناک سماج، مُردہ سماج، سنگدل سماج!

کچھ یُوں معلوم ہوتا جیسے سماج کوئی بے ہودہ سا آوارہ گرد شخص ہے۔ جس کا کام دن بھر ظلم کرنا اور لوگوں کو ڈرانا ہے۔ چنانچہ بچپن میں جتنا شیطان سے ڈر لگتا اتنا ہی سماج سے ڈرا کرتے۔

اس کے بعد ایک اور دماغی تصویر بن گئی۔ یہ لفظ بڑے بڑے دکھائی دینے لگے۔ سماج کا شکار۔۔۔ سماج کے تیز پنجوں میں حقیر سی جان۔ سماج کے بھیانک مُنہ کا نوالہ۔

کئی سال تک ہمارے لیے سماج ایک ڈراؤنا سا جانور رہا جو اُونٹ کی طرح بے تُکا، ریچھ کی طرح مکّار اور بھدّا اور چیتے کی طرح خوفناک تھا۔ کوئی پوچھے کہ یہ اُونٹ ریچھ وغیرہ اکٹھے کیسے ہو گئے؟ بس یونہی ہو گئے۔ لڑکپن ہی تو تھا اور پھر سماج کوئی سادہ سی چیز تو تھی نہیں۔ خیر کتنے ہی دنوں ہم سماج کو خوفناک درندوں میں گنتے رہے۔

اس کے بعد ذرا عقل مند ہوئے۔ اب سماج پر ایک نقّاد کی طرح غور کیا تو چند اور الفاظ کھٹکنے لگے۔ سماج کے ٹھیکیدار۔۔۔ سماج کے اجارہ دار۔ نتیجہ جو نکلا تو افسوس ہوا کہ اب تک سماج کو بالکل غلط سمجھتے رہے۔ سماج تو ایسی چیز ہے جس کا ٹھیکہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ کوئی تجارتی جنس ہو گی یا شاید کاروباری چیزوں میں سے کچھ ہو۔

بہر حال ہمیں یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ سماج کا ٹھیکہ لینا آسان نہیں۔ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں کیونکہ بچّہ بچّہ ان ٹھیکیداروں کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ ساری خلقت ان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑی ہے۔

کتنے دنوں ہمیں یہی تلاش رہی کہ کسی سماج کے ٹھیکیدار کا بغور ملاحظہ کریں۔ بازاروں میں تلاش کی، گلی کوچوں میں پھرے، ہر قسم ٹھیکیدار دیکھے۔۔۔ کوئلے کے، لکڑی کے، عمارتوں کے اور نہ جانے کس کس چیز کے۔۔۔ لیکن اس قسم کا ٹھیکیدار کہیں نہ ملا۔ سیانے لوگوں سے کہا کہ آپ ہی مشکل آسان کر دیجئے، لیکن کوئی مدد پر آمادہ نہ ہوا۔ پھر ایک خاتون سے جن کے ہر افسانے کے ہر صفحے پر ہر پانچ چھ سطروں کے بعد سماج کا لفظ آتا تھا، ملنے گئے اور بڑی عاجزی سے کہا کہ محترمہ! آپ کو تو ان ٹھیکیداروں کا اتہ پتہ معلوم ہو گا۔ اگر آپ ان میں سے کسی ایک کو اس خاکسار سے ملا دیں تو ایک بوجھ میرے سینے سے اُتر جائے۔ لیکن وہ یہی سمجھیں کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

سماج کی کہانیوں میں عموماً ایک مزدور کی محبّت کسی امیر لڑکی سے ہو جاتی ہے۔ فریقین مختلف ذات پات کے ہوتے ہیں۔ آنکھ جھپکتے ہی محبّت ہو جاتی ہے۔ پریم

کی شراب نینوں میں چھلکنے لگتی ہے۔ پریم کے تیر نینوں کو چیر کر دلوں میں کھُب جاتے ہیں۔ پھر رسوائی ہوتی ہے۔۔۔ اور رسوائی کیا اچھی خاصی پبلسٹی کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں نہ کچھ ہونا تھا نہ ہو سکتا تھا، لیکن سماج نہ جانے کہاں سے بیچ میں آ جاتا ہے۔ سماج کے ٹھیکیداروں سے اپیل کی جاتی ہے۔ پھر بغاوت ہوتی ہے اور محض سماج کی ضد میں ہیرو ہیروئن کو لے بھاگ نکلتا ہے۔۔۔ اگر ہیروئن پوچھے کہ بھلا ہم کہاں جا رہے ہیں؟ تو جواب ملتا ہے کہ۔۔۔ دُور۔۔۔ دُور! اس مکر و فریب کی دنیا سے بہت دور! جہاں آشائیں مچلتی ہیں۔ جہاں امنگیں پنپتی ہیں۔۔۔ جہاں سماج کا خوفناک پنجہ معصوم روحوں کا تعاقب نہیں کرتا! وغیرہ۔

اس قسم کی جگہ کی مجھے بڑی تلاش رہی ہے۔۔۔ خاص طور پر امتحان کی تیاری کے دنوں میں، تاکہ یکسوئی سے پڑھ سکوں۔ کوہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں سے سی پی کے جنگلوں تک اور وہاں سے سندھ کے ریگستانوں تک جا کر دیکھ لیا، لیکن اس قسم کی پر سکون جگہ کہیں نہیں ملی۔ جہاں بھی گیا وہاں وہی مکر و فریب کی قسم کی دنیا ملی۔

فرض کیا کہ دونوں چل پڑے۔ اب کہانی لکھنے والے کی ڈیوٹی ہے کہ وہ یا تو دونوں کی، ورنہ کم از کم ایک کی تو ضرور خود کشی کرادے ورنہ پھر کہانی ہی کیا رہی۔ اور اگر ایک انتقال کر گیا (یا کر گئی) تو دوسرے کا انجام بھی نزدیک ہی ہے۔ عموماً یہ بھی ہوتا ہے کہ دونوں اکٹھے سماج کے چنگل میں آجاتے ہیں اور شہیدانِ محبّت کی لاشیں کسی دریامیں تیرتی ملتی ہیں۔ یایوں ہوتا ہے کہ ایک کچھ دیر پہلے مرتا ہے اور دوسرا اس کی لاش پر چیخ مار کر گرتا ہے اور مر جاتا ہے۔ میری حقیر رائے میں اس قسم کی موت بہت مشکل ہے۔ مشکل کیا ایک حد تک ناممکن ہے۔ پھر یہ فقرہ آتا ہے۔ ”ان معصوم ہستیوں کی یاد میں جو سماج کی بھینٹ چڑھ گئیں۔“ اور آخر میں ان پر دل کھول کر لعنت بھیجی جاتی ہے۔ اسے خوب کوسا جاتا ہے۔ گالیاں دی جاتی ہیں۔

یہاں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ بھلا ایک مزدور سے کس حکیم نے کہا کہ وہ ضرور ایک سیٹھ کی لڑکی سے محبّت کرے۔ بالفرض وہ محبّت کر بھی لے تو پھر خوامخواہ اس سے شادی کرنے پر بھی اُتر آئے۔ کم از کم یہی سوچ لے کہ اسے لا کر بٹھائے گا کہاں۔

اس قسم کے لوگ کو کوسنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ٹھنڈے دِل سے عملی باتوں پر غور کر لیا کریں تو یقیناً افاقہ ہو گا۔

ایک دن میرے ایک واقف آئے جنہوں نے خلافِ معمول لمبے لمبے سانس لے۔ میں سمجھا کسی ڈاکٹر نے لمبے سانس لینے کی ورزش تجویز کی ہے۔ پھر انہوں نے بار بار پیٹ پر ہاتھ رکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ساتھ سینے کی بھی مالش کرنے لگے۔ مجھے رحم آنے لگا کہ بیچارے بیمار ہیں۔ درد ہو گا کہیں۔۔۔ ابھی تیمارداری کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وہ اُٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے دن ان کا یہی پروگرام بڑے زور و شور سے شروع ہوا۔ پوچھا کہ اب تک درد اچھا نہیں ہوا؟ ایک روز فاقہ کر لو تو بہتر ہو گا۔

بولے۔ "یہ درد تو اب جان لے کر ٹلے گا۔" میں ڈر گیا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ "کیا کبھی تمہیں کسی سے پریم ہوا ہے؟"

میں نے چمک کر کہا۔ "میرے دشمنوں کو ہو پریم، مجھے کیا مصیبت پڑی ہے!"

وہ مُنہ بسور کر بولے۔ "ہائے تم کیا جانو اس آگ کو، کیا سچ مچ تمہیں پریم نہیں ہوا؟"

"بتا تو دیا ایک دفعہ کہ نہ تو ہوا ہے اور نہ ہی ارادہ ہے۔ خوب نیند آتی ہے۔ سارے کھیل کھیل لیتا ہوں۔ دوسرے تیسرے دن سینما دیکھتا ہوں۔ میرے پاس ایک موٹر سائیکل بھی ہے۔ تندرست ہوں، مگن رہتا ہوں۔۔۔ پریم کی گنجائش ہی نہیں نکلتی۔۔۔!"

وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انہوں نے رُک رُک کر اپنی خونچکاں داستانِ حسن و عشق سنائی کہ کس طرح انہیں دفتر کے ایک افسر انچارج کی حسین لڑکی سے محبّت ہو گئی ہے اور وہ ابھی ان کی طرف دیکھ کر مُسکرایا کرتی ہے۔

مَیں نے پوچھا۔ "مُسکرایا کرتی ہے؟۔۔۔ کس بات پر؟"

وہ بولے۔ "میرے گھائل دِل پر مرہم لگانے کے لیے!"

"تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟"

"اس فرشتے کو اپنا بنانا چاہتا ہوں!"

"کس فرشتے کو؟ ابھی تو تم افسر کی لڑکی کا ذکر کر رہے تھے؟"

"اسی کو۔۔۔ اس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

مَیں نے پوچھا۔ ”تو پھر رکاوٹ کس بات کی ہے؟“

بولے۔ ”ظالم سماج!۔۔۔۔ یہ ہندوستان کی مصیبت۔ یہ لعنت، ذلیل سماج! سماج کے ٹھیکیدار جنہوں نے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ سماج کے اس مقتل میں معصوم زندگیاں ذبح ہو رہی ہیں۔ سماج کا بیڑا غرق ہو۔۔۔۔!“

مَیں نے جلدی سے کہا۔ ”چچ چچ۔۔۔ یوں سماج کی گردان مت کرو۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری آمدنی کیا ہے؟“

بولے ”ایک سو اٹھانوے روپے، دس آنے اور چار پائی!“

”اور افسر انچارج کی؟“

”ساڑھے آٹھ سو!“

”تو تم یہ چاہتے ہو کہ سماج تمہاری تنخواہ اتنی بڑھا دے کہ تم ان کی لڑکی سے شادی کر سکو؟“

”نہیں تو۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔ وہ دیکھے نا میرا مطلب ہے کہ سماج۔۔۔“

"فضول گفتگو سے پرہیز کرو! بہتر ہو گا کہ تم ان ایک سو اٹھانوے روپے، دس آنے، چار پائیوں ہی پر قانع رہو اور پھر تم نے کبھی غور سے اپنی شکل کسی اچھے سے آئینے میں۔۔۔۔"

"آہ! تم نہیں جانتے پریم شکل صورت، آمدنی اور تنخواہ وغیرہ سب سے بلند ہے!"

"یہ سب فضول ہے۔ نکمّی باتیں ہیں۔ مَیں نہیں مانتا۔ تم اس وقت اپنی صورت کسی آئینے میں!"

"آہ! ظالم سماج!"

"خبردار! اگر اب تم نے سماج کو بُرا بھلا کہا تو شاید میں تمہارے کان کھینچنے پر مجبور ہو جاؤں۔" مَیں نے سماج کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

اکثر حضرات افسانے کو پڑھنے سے پہلے صفحات کو جلدی سے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں اور اگر انہیں کہیں سماج کا لفظ نظر آ جائے تو وہ فوراً افسانہ چھوڑ دیتے ہیں۔ پوچھا جائے کہ یہ کیوں؟ تو جواب ملتا ہے۔ "جناب اس کا پلاٹ تو پہلے ہی معلوم

ہو گیا۔ یقین نہ ہو تو سُن لیجئے!" اس کے بعد وہ پلاٹ بھی سُنا دیں گے جو قریب قریب صحیح ہی نکلے گا۔

پانچ چھ سُرخیاں تو ہیں ہی۔۔۔ بے جوڑ محبّت۔۔۔ امیری غریبی کا رونا۔۔۔ عاشق کے بیوی بچّوں کی علالت، سیٹھ کا مٹاپا اور دولت۔ بیکاری کی حمایت۔ سماج سے اپیل۔ خود کُشی، دوسرے نمبر پر بوڑھے آدمیوں کی کہانیاں ہوتی ہیں کہ کس طرح ایک غریب ضعیف آدمی پر مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اسے دوا تک کو پیسے میسّر نہیں ہوتے اور پڑوس کے محل میں جشن ہو رہا ہے۔

نغموں کی صدا اتنی بلند تھی کہ اس بوڑھے کے کراہنے کی مدھم آواز کو دبا لیا۔

اُدھر مسرت تھی، مستی تھی۔ سرمایہ داری نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی۔ ادھر ایک غریب بیماری میں مبتلا تھا۔ اس کی کمزور ہڈیاں چیخ رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں میں رعشہ تھا۔ داڑھی پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور زمین کھودنے لگا۔ جس میں ایک زنگ آلود صندوقچی نکلی اور اس میں کیا تھا؟ آہ! اس میں ایک حسین لڑکی کی دھندلی سی تصویر تھی۔ بوڑھے نے ایک آہِ سرد کھینچی۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ وہ بولا "آہ ظالم سماج! ایک لمحے بعد اسے غش آ گیا اور

پڑوس میں نغموں کی صدائیں بلند ہوتی جا رہی تھیں!" اب اس میں سماج کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔

ایک تو یہ کہ وہ شخص بوڑھا کیوں ہوا؟ ہمیشہ جوان کیوں نہ رہا؟ بوڑھا تو آخر ہر کوئی ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا آرڈر ہے! جو جوانی میں چھلانگیں لگاتا پھرے گا، وہ ایک دن بوڑھا بھی ہو گا۔ دوسرے یہ کہ وہ بوڑھا بیمار کیوں ہوا؟ ضرور سماج کی شرارت ہے۔ طبّی کتابیں پڑھیے تو پتہ چلے گا کہ بوڑھے آدمی عموماً بیمار رہتے ہیں اور بڑھاپا بذاتِ خود ایک بیماری ہے۔

پھر یہ کہ وہ بوڑھا اتنا غریب کیوں تھا؟ پھر یہ کہ اسے جوانی میں جو محبّت تھی، اس میں سماج نے خواہ مخواہ اپنی ٹانگ کیوں اڑائی؟ کیوں اس کی محبوبہ کو اس سے چھین لیا؟ کیا حق تھا سماج کو دو پریم کے متوالے دِلوں کو توڑنے کا؟ اور ہاں ایک بات رہ گئی۔ وہ یہ کہ پڑوس میں ایک محل کیوں تھا؟ اور سماج کی سازش سے اس میں اسی رات جشن کیوں ہوا؟ (مرثیہ گوئی کیوں نہ ہوئی؟) سو یہ محل وقوع کا قصور ہے۔ حدود اربعہ کا قصور ہے اور پڑوسی سیٹھ کے پروگرام کا قصور ہے اور آخر میں ان افسانوں کا قصور ہے جنہیں پڑھ کر اچھے بھلے انسان کو مالیخولیا ہو جائے۔

یا شاید سماج اس طاقت کا نام ہے جو کسی شخص کو اپنا واجب ناواجب مقصد پورا کرنے سے روکتی ہے۔ لوگوں کو فوراً امیر ہونے سے روکتی ہے۔ معمولی شکل و آمدنی والے عاشقوں کی محبّت میں حائل ہوتی ہے۔ ایک اَن پڑھ مزدور کو کار میں بیٹھنے سے باز رکھتی ہے۔ کسی کوشش کا نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا یا کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کر بیٹھے تو بجائے اصل وجہ سمجھنے کے کہہ دیا کہ ظالم سماج کا قصور ہے۔

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصوروار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دُور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو مُنہ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے۔ کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سماج کی برائی ہے اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا تو بھی سماج کو ہی کوسا جائے گا۔ نالائق لڑکے امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے۔ یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں گی کہ خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے۔ یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں کر۔ یا پرماتما نے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا۔ اور دعائیں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔ پیسہ دیتا جا بابا خدا تجھے سماج سے بچائے۔ یا میرے اللہ مجھے سماج کی ہوا سے بچائیو۔ وغیرہ۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سماج کے متعلق زیادہ سوچنے والوں یا لکھنے والوں میں بیشتر تعداد کمزور، چڑچڑِے اور غمگین حضرات کی ہے۔ تندرست اور ہنس مکھ آدمیوں کو کبھی سماج کی غیبت کرتے نہیں سنا گیا۔ شاید وہ جانتے ہی نہیں کہ سماج کس جانور کا نام ہے اور اگر کوئی ان سے سماج کی برائیاں کرنے لگے تو وہ اسے اتنی سی اہمیت نہیں دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے متعلق سوچتے رہنا ایک بیماری ہو جس کا تعلق خون کی کمی، اعصاب کی کمزوری اور ہاضمے کی خرابی سے ہوتا ہے۔ ایسی بیماری اس وقت تک رفع نہیں ہوتی جب تک دیگر شکایات دور نہ کی جائیں۔ اور اگر اس مرض کو ہو نہی چھوڑ دیا جائے تو مریض کی حالت خطرناک ہوتی جاتی ہے۔ ذرّے ذرّے میں اس سماج کی کرشمہ سازیاں نظر آتی ہیں۔۔۔ رنگ رنگ کے پھول دیکھ کر اسے افسوس ہوتا ہے کہ یہ مسرور کیوں ہیں۔ سوکھے ہوئے پتّوں کو دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔ سوچتا ہے کہ یہ سوکھے ہوئے کیوں ہیں۔ کوؤں کو دیکھ کر غمگین ہو جاتا ہے کہ یہ کالے کیوں ہیں؟ کسی کو ہنستے دیکھ کر اس کا خون کھولنے لگتا ہے اور یوں مُنہ بناتا ہے جیسے کہ رہا ہو۔ "ہنستا ہے بے؟ ابھی کہہ دوں گا سماج سے۔" اسے خواب بھی عجیب و غریب دکھائی دیتے ہیں، جیسے سارا ملک ایک بہشت ہے جس میں نہ جنگل ہیں، نہ پہاڑ ہیں، نہ صحرا ہیں، نہ دریا۔ نہ کسی دوسرے ملک کو یہاں سے کوئی راستہ جاتا ہے۔ بس ایک پیارا پیارا وطن

ہے۔ نہ اونچی عمارتیں ہیں نہ جھونپڑیاں۔ جدھر نظر جاتی ہے ایک منزلہ کوارٹر نظر آتے ہیں۔ آدمیوں میں ذات پات کی تمیز مٹانے کے لیے انہیں نمبروں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً ابّا کا نمبر ہے تین سو پچاس ۴ / الف۔ بڑا بیٹا سولہ سو تیس ن / ج ہے اور چھوٹی بچّی سترہ سو سولہ ب / ل ہے۔ سب کے سب ایک قد کے ہیں۔ ایک رنگ ہی ہے اور ایک جیسے لباس۔ شکلیں بھی اتنی ملتی ہیں کہ بس نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔

کارخانوں میں مزدوروں کا نام و نشان تک نہیں۔ مشینیں خود بخود چل رہی ہیں اور جو کام ایسے تھے جن کے لیے مزدوروں کی اشد ضرورت تھی وہ بند کر دیئے گئے ہیں۔

ہر ایک کے پاس ایک خوبصورتی کار ہے اور ایک حسین بیوی۔ کار کی پچھلی سیٹ پر چند بکریاں بیٹھی جگالی کر رہی ہیں۔

لوگ جہاں چاہیں، جس وقت چاہیں، جس سے چاہیں، بلا روک ٹوک پریم کر سکتے ہیں۔ نہ صرف پریم بلکہ شادی بھی کر سکتے ہیں۔ قرض لے سکتے ہیں۔ لڑ جھگڑ سکتے ہیں۔

پتہ نہیں یہ سب کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہو جائے تب بھی سماج کو کوسنے والے خوش رہیں گے یا نہیں؟ غالباً نہیں! شاید اس قسم کے بیمار سماج حضرات کا علاج۔۔۔ لوہے کا ٹانک، مچھلی کا تیل، فروٹ سالٹ، ورزش اور تبدیلیٔ آب و ہوا ہے۔ بہتر ہو گا اگر ان کے ٹانسل نکلوا دیئے جائیں اور خراب دانت بھی!

ان سے زبردستی ورزش کرائی جائے اور انہیں ہنس مکھ حضرات کی صحبت میں رکھا جائے۔ افاقہ ہونے پر انہیں تاکید کی جائے کہ اپنی صحت برقرار رکھیں، مبادا کہیں پھر دورہ پڑ جائے۔

کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ سماج کا مذاق بہت پرانا ہو چکا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سماج (جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں بھی ہے) اس کی وہ مٹی پلید ہوئی ہے جس کی انتہا نہیں۔ اب مارے شرم کے اس نے اپنی بہت کچھ اصلاح کر لی ہے۔ وہ پشیمان ہے۔ آپ کے سامنے سر جھکائے کھڑا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ یہ سچّے دل سے معافی کا خواستگار ہے۔ کیا آپ اسے معاف نہیں کریں گے؟ اسے ضرور معاف کر دیجئے اور اس کا ثبوت اس صورت میں مل سکتا ہے کہ انسانوں میں غریب سماج پر مزید لعنت ملامت نہ کی جائے بلکہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا

جائے۔ افسانوں میں خود کُشی کے واقعات ذرا کم ہو جائیں اور مزدور سیٹھوں کی لڑکیوں سے محبّت کرنا چھوڑ دیں۔ پریم کے متوالے اگر پریم کر کے ضرور ثواب لوٹنا چاہتے ہوں تو اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ہی ذات پات میں محبّت کیا کریں اور محبّت کرنے سے پہلے ذرا کسی اچھے سے آئینے میں اپنا چہرہ بھی بغور ملاحظہ فرما لیا کریں۔

باقی رہے سماج کے ٹھیکیدار! سو جب سماج میں وہ بات نہ رہے گی تو ان کی ٹھیکیداری کیا خاک چلے گی؟ سارا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ خود سیدھے راستے پر آ جائیں گے۔

یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لِللہ آپ سماج کی خطائیں معاف کر دیجیے!

ڈرپوک

اتنے دنوں کے بعد آج صبح موٹر سائیکل کو ہاتھ لگایا۔ اسے چلاتے وقت جیسے ٹھٹھک کر رہ گیا اور نظریں سامنے کی کھڑکیوں کی جانب چلی گئیں۔

آج سے کئی سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ گلاب کے تختے بالکل سُرخ ہو رہے تھے۔ شبنم کے چمکیلے قطروں سے ہر طرف موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ رنگ برنگ پرندے سریلی سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ جب میں نے اور ایک سنہرے بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی ننھی منی گڑیا نے ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر دی تھی۔

اس روز ہمیں موقع مل گیا۔ اختر نے مہینہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ صبح شام اٹھتے بیٹھتے بس ایک فقرہ ہو گیا تھا جس کا ورد وہ کرتی رہتی۔ تم ڈرپوک ہو۔ تم ڈرتے ہو۔ تم یُوں ہو، تم وُوں ہو۔

کئی بار اس سے کہا کہ میں بالکل نہیں ڈرتا۔ آخر سائیکل تو چلا ہی لیتا ہوں۔ لیکن موٹر سائیکل کس طرح چلاؤں؟ چلانا تو ایک طرف رہا میں تو اسے ہلا بھی نہیں سکتا۔ نہ یہ پتہ ہے کہ چلانے کے لیے کون سی کمانی گھماتے ہیں اور اگر چل پڑے تو روکتے کس طرح ہیں؟

وہ مُنہ چڑا کر کہتی۔ ڈاکٹر صاحب تو روز چلاتے ہیں، چلانا سیکھ کیوں نہیں لیتے۔

میں کہتا۔ سبق ہو تو یاد کر لوں۔ وہ تو ہینڈل پکڑ کر ایک دولتّی سے مارتے ہیں اور پھٹ پھٹ کی آواز آنے لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا کھینچا تانی کرتے ہیں کہ دیکھتے دیکھتے موٹر سائیکل ہوا ہو جاتی ہے۔

تب کہا جاتا ہے کہ "تم یہ سب کیوں نہیں کر سکتے؟ بس ڈرتے ہو نا!"

مَیں سمجھا کہ ابھی موٹر سائیکل کے برابر تو ہم خود ہیں۔ بڑے ہو گئے تو موٹر سائیکل چھوڑ پوری گاڑی چلایا کریں گے۔ بھلا کبھی ہمارے جتنے بچوں کو موٹر سائیکل پر چڑھتے کہیں دیکھا ہے؟

اس کے جواب میں ایک تصویر پیش کی جاتی۔ ایک موٹر سائیکل کوئی لڑکا چلا رہا ہے اور ایک لڑکی پیچھے بیٹھی ہے۔ میں بہتیرا کہتا کہ یہ تصویر فرضی ہے۔ یونہی کسی نے کھینچ دی ہے، لیکن جواب وہی ملتا کہ بس ڈرپوک ہو۔

اختر کے کہنے پر میں طرح طرح کی حماقتیں کر چکا تھا۔ ہم دونوں نے مشورہ کر کے ابّا جان کی سنہری گھڑی کیاری میں بو دی۔ اختر کا خیال تھا کہ پودے میں پہلے تو ننھی مُنّی گھڑیاں لگیں گی۔ پھر ٹائم پیس لگیں گے اور جب پودا بڑا ہو کر درخت بن جائے گا تو تب کلاک لگیں گے۔ لیکن باوجود ایک ماہ کی دیکھ بھال اور پانی دینے کے کچھ بھی نہ ہوا۔

پھر اس کے مجبور کرنے پر بہادر بننے کے سلسلے میں ابّا جان کی بندوق چلا دی۔ جب بندوق چلی تو میں کہیں گرا اور بندوق کہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میری غلیل تک چھین لی گئی۔ اختر کہتی تھی کہ جو چیز جانور کو جا لگتی ہے وہ سالم بندوق ہی ہوتی ہے۔ یہ گولی اور چھرے یونہی بناوٹی چیزیں ہیں۔ اس روز بندوق چلانے پر کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا۔ یہ ضرور ہوا کہ گولی تو خدا جانے کہاں گئی، البتہ چھت پر ڈبو میاں (جو غالباً بلّی سے لڑ کر چھپ کر دھوپ سینک رہے تھے) تڑپ کر اچھے اور ساتھ رکھے ہوئے ٹب میں جا پڑے اور وہاں سے اچھل کر روشن دان میں سے

ہوتے ہوئے سیدھے کمرے میں جا گرے جہاں آپا کے پاس ہونے کی خوشی میں پارٹی ہو رہی تھی۔ بھیگے کتّے کو اس انداز سے کمرے میں آتے دیکھ کر خدا جانے ان کی سہیلیوں پر کیا بیتی۔ آپا بے حد ناراض ہوئیں۔ ان کے رنگ برنگے سیٹیاں بجانے والے پرندے سہم کر رہ گئے۔ اور وہ کم بخت طوطا تو یوں دُبک گیا جیسے مر ہی گیا ہو۔

پھر پریوں کی بہت سے کہانیاں پڑھنے کے بعد اختر کے کہنے پر ساری رات چھوئی موئی اور نرگس کی کلیوں پر پہرہ دینے میں گزار دی۔ ہم وہاں پریاں پکڑنے گئے تھے۔ اختر کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا جال تھا (جس سے ہم تتلیاں پکڑا کرتے تھے) ہم دبے پاؤں پہرہ دیتے رہے، جب چاند طلوع ہوا تو ہم اور بھی محتاط ہو گئے۔ اس رات مجھے بڑا ڈر لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سبکیاں آ رہی تھیں۔ جب مرغ کی اذان سنائی دی تو اپنے اپنے کمروں میں جا دُبکے۔ صبح صبح ہمیں کھانسی بھی ہو گئی اور زکام بھی۔

سہ پہر کو ہم باغ میں کھیل رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے منشی جی نماز پڑھ رہے تھے۔ اختر کی اور منشی جی کی آپس میں چشم چوٹ رہتی تھی۔

اختر بولی۔ ”جب کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

''کیا مطلب؟''

بولی۔ ''اب یہ جو منشی جی نماز پڑھ رہے ہیں۔ اگر تم ان کا کان کاٹنا چاہو تو ہر گز نہیں کاٹ سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''کاٹ سکتا ہوں۔'' وہ بولی۔ ''بالکل نہیں۔'' مَیں مُصر ہوا۔ آخر طے ہوا کہ جب منشی جی اس دفعہ نیّت باندھیں تو میں ان کا کان کاٹ دوں۔ شرط بھی لگی۔ اختر دوڑ کر چچا جان کی شکاری چھری لے آئی۔ میں نے اچھی طرح چھری پکڑی اور تاک میں بیٹھ گیا۔ منشی جی سجدے میں گئے۔ اب جو وہ بیٹھے ہیں تو لپک کر ان کا کان پکڑا اور چھری پھیر دی۔ اِدھر کان ہے کہ کٹتا نہیں۔ میں ہوں کہ زور لگا رہا ہوں۔ کیا مجال ہے کہ منشی جی ذرا بھی ہلے ہوں، بدستور نماز پڑھتے رہے۔ اختر کے قہقہوں پر نوکر آ گئے۔ جو دیکھتا ہوں تو چھری اُلٹی پکڑ رکھی ہے۔ نوکروں کو دیکھ کر ہم وہاں سے بھاگے۔ کتنے دِنوں تک ڈرتا رہا کہ اگر چھُری کی دھار منشی جی کے کان پر پھیر دیتا تو واقعی ان کا کان میرے ہاتھ میں آ جاتا اور پھر خون بھی نکلتا۔

ایک روز ہم آپا کے ساتھ سینما گئے، جہاں مُکّے بازی کی فلم دیکھی۔ اختر کو مُکّا بازی بہت پسند آئی۔ گھر پہنچ کر کہنے لگی، آؤ لڑیں۔ مجھے ان دنوں بخار آتا تھا۔ وہ ساری گرمیاں پہاڑ پر گزار کر آئی تھی اور خوب سُرخ ہو رہی تھی۔

پہلے تو ٹال مٹول کی کہ بھلا ایک لڑکی سے کیا لڑوں گا۔ وہ کہنے لگی تم ڈرتے ہو۔ خیر مُکّا بازی ہوئی۔ اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ نوچ لیا اور جب میں نے اسے دھکیلا تو اس نے دوڑ کر میری کلائی میں اس بُری طرح کاٹا کہ اب تک نشان موجود ہے۔ پھر جو روئی ہے تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ تتلیوں کے سارے پَر، چاکلیٹ سے نکلی ہوئی تصویریں، گولیاں۔۔۔۔۔ جو کچھ میرے پاس تھا سب کچھ اسے دیا۔ تب جا کر چپ ہوئی۔

میں کچھ ایسا ڈرا بھی نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اختر کے جنوں بھوتوں کے قصّوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ صبح سے شام تک طرح طرح کی جھوٹی سچّی کہانیوں سنایا کرتی اور میں یقین کر لیتا۔ رات کے گیارہ بجے ہوں گے۔ سب سیکنڈ شو دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کو اُستانی جی پڑھا کر چلی گئیں۔ کمروں میں ڈر لگتا تھا۔ اس لیے دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے۔ باہر زور سے بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔

اختر نے ایک کہانی شروع کی۔ ”اندھیری رات تھی۔ ایک بہت ہی ڈراؤنے اور اُجاڑ جنگل سے ایک ٹرین گزر رہی تھی۔ بُری طرح بارش ہو رہی تھی۔ ایک لمبے خطرناک سے ڈبّے میں صرف دو آدمی بیٹھے تھے۔“

مجھے ڈر لگنے لگا۔ یہ اختر بھی خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتی ہے۔ بھلا ریل کا ڈبّہ خطرناک کیسے ہو گیا! سوچنے لگا شاید اب یہی ہو گا کہ ایک آدمی دوسرے کی مرمت کرے گا۔ یا چلتی ریل سے باہر پھینک دے گا۔ میں نے اپنی کرسی کھینچ کر اس کے نزدیک کرلی۔

وہ بڑے اطمینان سے کہانی سنا رہی تھی۔ ”دونوں آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بجلی زور سے کڑکی اور ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ کیوں جناب بھوت پریت پر آپ کا اعتقاد ہے یا نہیں؟“

دوسرا بولا۔ ”نہیں قطعاً نہیں۔ اور آپ؟“

پہلا بولا۔ ”میرا تو ہے۔ اور یہ کہتے ہی وہ دھواں بن کر اُڑ گیا۔“

”دھواں بن کر اُڑ گیا؟ کہاں اُڑ گیا؟“ مَیں نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا۔

”بھئی غائب ہو گیا۔ دراصل وہ خود بھوت تھا اور آدمی کا بھیس بدلے بیٹھا تھا۔“

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر کیا ہونا تھا۔ جو بیچارہ ڈبّے میں رہ گیا تھا اس کا کیا حال ہوا ہو گا؟ ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔"

میں نے اپنی کرسی اور نزدیک کھینچ لی۔

وہ ڈراؤنا مُنہ بنا کر بولی۔ "اور اگر میں یہاں بیٹھی بیٹھی غائب ہو جاؤں؟ بس دھواں بن کر اڑ جاؤں تب؟"

مَیں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اتنے زور سے دبوچا جیسے وہ سچ مچ اُڑ جائے گی۔ وہ کہنے لگی۔ "اور جو میں انسان نہ ہوں تب؟ کچھ اور ہوں تو؟"

میں اس قدر ڈرا کہ ایسی سرد رات میں بھی اتنا پسینہ آیا کہ کپڑے بھیگ گئے۔ مدّتوں میں سوچا کرتا کہ کیا ہو جو یہ اختر کوئی چڑیل وغیرہ ہی ہو۔

ایک رات امّی بولیں۔ "ننھے ذرا اندر سے ٹارچ اٹھا لاؤ۔ مالی کہیں باہر جائے گا۔"

مَیں بڑا دلیر بن کر اندھیرے کمرے سے ٹارچ اٹھا لایا۔

اختر بولی۔ ”بڑے بہادر بنے پھرتے ہو۔ وہ کہانی بھی سُنی ہے تم نے اندھیرے کمرے اور ماچس والی؟“

میں سہم گیا۔ ”وہ کون سی کہانی؟“

”وہی کہ ایک شخص اندھیرے کمرے میں ماچس لینے گیا۔ اندر سخت تاریکی تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر ٹٹول رہا تھا کہ یکلخت اس کے ہاتھ میں ماچس تھمادی گئی۔“

”ماچس دے دی۔ کس نے؟“

”نہ جانے کس چیز نے دے دی۔ وہ شخص چیخ کر باہر بھاگا۔ لوگوں نے بہتیرا تلاش کیا لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ لہٰذا اندھیرے کمرے میں جاتے ہوئے ذرا ہوشیار رہنا چاہیے۔“

اس کے بعد مدّت تک میں کسی اندھیرے کمرے میں نہیں گیا۔

آخر اس کے بار بار کہنے پر تنگ آ کر میں نے تہیّہ کر لیا کہ ضرور ایک روز موٹر سائیکل چلاؤں گا۔ اختر کو یقین تھا کہ سارا ڈر تب تک ہے جب تک موٹر سائیکل

چلتی نہیں۔ ایک دفعہ چل پڑے تو بس پھریوں لگے گا جیسے معمولی سائیکل چلا رہے ہو۔

جب کبھی ڈاکٹر صاحب موٹر سائیکل چلاتے تو ہم بڑے غور سے سارا عمل دیکھے۔ شروع شروع کی باتیں تو سمجھ میں آ جاتیں، لیکن بعد میں جو تین چار حرکتیں اکٹھی کر جاتے ان کا کچھ پتہ نہ چلتا۔

اختر بولی۔ ''تم پوچھ کیوں نہیں لیتے ڈاکٹر صاحب سے۔''

میں نے کہا۔ ''بتائیں گے نہیں اور ممکن ہے کہ ناراض ہو جائیں اور پینے کو سخت کڑوی کسیلی دوائیاں دیں۔''

بولی۔ ''تم ڈرپوک ہو۔''

میں جھلّا اٹھا اور سینہ پھُلا کر بولا۔ ''آج ڈاکٹر صاحب سے ضرور پوچھوں گا۔''

ڈاکٹر صاحب اندر سے نکلے۔ میں برآمدے میں کھڑا تھا۔ ان کے ساتھ باہر تک گیا انہوں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے جو عجیب طرح گھور کر دیکھا تو میں گھبرا گیا۔ اختر کھڑکی کے پردوں سے جھانک رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''سناؤ بچّے کیسے ہو؟''

”جی بالکل اچھا ہوں۔ ایک بات پوچھنے آیا تھا۔ بات یہ ہے کہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔ اگر آپ اجازت دیں تو ہم باغ میں جا کر گالیاں اور مُوجریں کھالیا کریں۔“

”کیسے مہمل الفاظ استعمال کر رہے ہو برخوردار! یقیناً بہت بُرا املا لکھتے ہو گے۔ میں اُستانی صاحبہ سے ضرور کہوں گا۔ گالیوں اور مُوجروں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”جناب میں کہہ رہا تھا کہ مُولیاں اور گاجریں، غلطی سے وہ۔“

”اُفّوہ!۔۔۔۔۔ہاہاہا۔۔۔۔ہی ہی ہی۔۔۔خوب! ہاں گاجریں مفید ہیں اگر تھوڑی مقدار میں کھائی جائیں تب!“

مَیں نے بڑی مسمّی شکل بنا کر اختر کی طرف دیکھا۔ اس نے میرا مُنہ چڑا دیا۔ میں یکلخت ایک بہادر لڑکا بن گیا۔

”ڈاکٹر صاحب! ایک بات ہے۔ آپ ناراض تو نہ ہوں گے۔ پوچھوں؟“

”ضرور پوچھو برخوردار! یقیناً تمہارے سر میں درد ہو گا کیوں؟“

میں پھر گھبرا گیا۔

”ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کی ٹائی بہت خوشنما ہے۔ بالکل اسی رنگ کی ایک تتلی ہم نے پکڑی تھی۔“

ڈاکٹر صاحب شرما گئے۔

اختر نے میرا مُنہ چڑایا۔ مَیں جلدی سے آگے بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مجھے دیکھا اور میں پھر بوکھلا گیا۔ میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! آپ بہت اچھے ہیں۔ اب میں ضرور آپ کا کہا مانوں گا۔ آپ جس وقت چاہیں میری زبان دیکھ سکتے ہیں۔ اگر اب آپ کہیں تو میں حلق بھی دکھادوں۔ یہ دیکھئے۔“

اُدھر کیا تو وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے کیا چونک پڑے۔ ”ننھے تم ضرور جامنیں کھا کر آئے ہو۔ تمہاری زبان رنگی ہوئی ہے۔ اور دیکھو!“ میں وہاں سے سرپٹ بھاگا۔

اختر نے مجھے پکڑ لیا۔ مُنہ بنا کر بولی۔ ”آپ کی ٹائی نہایت اچھی ہے جناب، آپ کی مونچھیں بہت بڑھیا ہیں جناب، آپ بہت اچھے ہیں جناب، ڈرپوک کہیں کے! دو لفظ مُنہ سے نکلے کہ آپ کی موٹر سائیکل کس طرح چلتی ہے جناب۔“

میں نے کہا۔ ”کسی اور سے پوچھ لیں گے۔ بجلی کا مستری ہے۔ ڈاکیا ہے، شوفر ہے، اُستانی جی ہیں۔ کوئی نہ کوئی تو بتا ہی دے گا۔“ لیکن ہمیں کسی نے نہ بتایا۔ شاید قسم کھا رکھی تھی سب نے۔ آخر ہفتہ بھر کی محنت کے بعد مجھے کچھ کچھ پتا چل ہی گیا کہ اسٹارٹ کس طرح کرتے ہیں۔ اب سوال تھا روکنے کا۔ اختر بولی۔ ”جب چل پڑے گی تب دیکھا جائے گا۔“

کئی روز تک موقع نہ مل سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ جانے کہاں سے بیہودہ سی موٹر خرید لی تھی۔ جب وہ ایک میل دور ہوتے تب سے ہمیں پتہ چل جاتا کہ ڈاکٹر صاحب آ رہے ہیں۔ موٹر کا شور اتنا تھا کہ ہارن کی ضرورت نہیں تھی۔ دو چار مرتبہ موٹر سائیکل بھی لائے، لیکن فوراً واپس چلے گئے۔ پھر یکلخت ان کا آنا جانا بند ہو گیا۔

میں تو دِل ہی دِل میں خوش تھا لیکن اختر ہر روز مجبور کرتی کہ ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔ بڑی منتوں سے کہتا کہ کسی طرح بلاؤں آخر؟ ڈاکٹر صاحب کو بلانے کے لیے کم از کم ایک آدھ کو تو ضرور بیمار ہونا چاہیے۔

ایک صبح ہمیں پتہ چلا کہ چچا جان کے کان میں درد ہے۔ فوراً سوجھی کہ ڈاکٹر صاحب کو چچا جان کی طرف سے فون کیا جائے۔ ہم چوری چوری ٹیلیفون کے

کمرے میں گئے اور کمرہ چاروں طرف سے بند کر لیا۔ اختر نے مجھ سے کہا کہ موٹی آواز میں چچا جان کی طرح بولوں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے فون کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بھاری کی آواز آئی۔ ”ہیلو!“

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہے ہے ہیلووو!“ پہلے آواز بالکل باریک تھی پھر اختر کی چٹکی سے یکلخت موٹی ہو گئی۔

”کون صاحب ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہم ہیں۔۔۔۔ میرا مطلب یہ کہ میں ہوں (پھر بہت موٹی آواز سے) میں ہوں!“

”آپ کی تعریف؟“

”میں ہوں چچا جان! اور میرے کان میں درد ہے۔ (میں گھبرا گیا اور آواز پھر پتلی ہو گئی) جناب ڈاکٹر صاحب اس وقت فون پر چچا جان بول رہے ہیں۔ آپ ذرا تشریف لے آیئے۔“

”صاحب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے اور میں کہاں آؤں؟“ آواز آئی۔

اختر نے میرے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا اور بھاری آواز سے بولی۔ ”آپ پہچانتے ہی نہیں ڈاکٹر صاحب! میں ہوں (چچا جان کا نام لے کر) آپ ذرا آیئے تو سہی!“

”اُفوّہ! ابھی حاضر ہوا۔“

ہم بھاگے بھاگے سیدھے باغ کی طرف اور فوّارے کی آڑ میں چھپ گئے۔ پھٹ پھٹ کرتی ڈاکٹر صاحب کی موٹر سائیکل کوٹھی میں داخل ہوئی۔ انہوں نے حسبِ معمول اسے برآمدے کے سامنے ٹھہرادیا اور اندر چلے گئے۔ میرا حلق خشک تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ لیکن اختر کو ذرا بھی پروانہ تھی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور لپکی سیدھی موٹر سائیکل کی طرف۔ اس نے ایک دفعہ پھر مجھے ڈانٹا اور ڈرپوک کہا۔ میں ذرا بہادر سا بن گیا۔ ہم نے موٹر سائیکل کو بمشکل ہلا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ طے ہوا کہ پہلے اختر پچھلی سیٹ پر بیٹھے اور جب میں بیٹھوں تو وہ میری کمر پکڑے۔

جونہی اس نے میری کمر پکڑی میں اچھل کر اُتر کھڑا ہوا، کیونکہ اتنی گُدگُدی ہوئی کہ کھِلکھِلا کر ہنسنے لگا۔ "یوں نہیں، یوں تو گُدگُدی ہوتی ہے۔" بولی "اچھا اب کوٹ پکڑ لوں گی۔" میں پھر بیٹھا۔ ادھر اس کا ہاتھ لگا اور میں ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔ میں نے کہہ دیا کہ اس طرح تو میں گر پڑوں گا، چلانا تو ایک طرف رہا۔ پوچھنے لگی کہ کہاں گُدگُدی نہیں ہوتی؟ میں نے کہا بازو پکڑ لو۔ اس نے مضبوطی سے بازو پکڑا۔ اِدھر میں پورے زور سے اچھل کر سٹارٹر پر کودا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب فوراً باہر نکلے۔ "لینا پکڑنا!"

موٹر سائیکل جو تیزی سے چلی ہے۔ کچھ پتہ نہ تھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ موتیے کے تختوں اور پھول دار بیلوں کو روندتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ فوّارے سے بال بال بچے۔ موڑ پر ڈبو میاں کو بچایا ورنہ وہ نیچے ہی آ چلے تھے۔ پھر موٹر سائیکل یکلخت تیز ہو گئی۔ ہم نے ایک قلابازی سی کھائی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور کچھ پتہ نہ چلا کہ ہم موٹر سائیکل کے اُوپر تھے یا وہ ہمارے اُوپر۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بالکل بیہوش ہو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو سدابہار ٹہنیوں میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ نکلنا محال تھا۔ ہاتھ مُنہ لہولہان ہو رہے تھے۔ اب جو ہلنے کی کوشش کرتا ہوں تو بازو شل دیکھتا

ہوں کہ اختر بازو سے چمٹی ہوئی ہے۔ آنکھیں بند ہیں لیکن گرفت اس طرح ہے۔

بڑی مشکل سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب! چچا جان اور نوکر ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ اپنا بازو چھڑانا چاہا۔ بہتیرا کہا کہ اب تو ہاتھ چھوڑ دو۔ لیکن اس کی گرفت بدستور رہی۔ بڑی مصیبتوں سے ٹہنیوں سے باہر نکالا اور ساتھ ہی میرے بازو سے لٹکی ہوئی اختر! موٹر سائیکل سدا بہار کی گھنی ٹہنیوں کے اس طرف نکل گئی تھی اور ہم جھاڑی میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ ہمیں دھمکایا گیا۔ ہر قسم کی ڈانٹ دی گئی۔ بزرگوں سے لے کر چھوٹوں تک سب نے ہمیں حسبِ توفیق لیکچر دیئے۔ ٹیلیفون کو ایک اونچی سی الماری پر رکھ دیا گیا (غالباً وہ یہ بھول گئے کہ ہم میز یں رکھ کر بھی پہنچ سکتے تھے) ڈاکٹر صاحب نے توبہ کی کہ وہ کبھی موٹر سائیکل پر ہمارے ہاں نہ آئیں گے اور اسی بیہودہ موٹر میں آیا کریں گے جس سے ہمیں نفرت تھی۔ اختر کے ابّا کو یہ ساری کہانی لکھ کر بھیجی گئی اور ہمیں کسی دُور دراز سکول میں بھیجنے کی دھمکی دی گئی۔

کچھ دنوں بعد اختر کہیں چلی گئی۔ مجھے بھی کسی اور جگہ پڑھنے بھیج دیا گیا۔ پھر مدّت کے بعد اس کی تصویر آئی جس کے ہاتھ اور کپڑے مٹی میں لتھڑے رہتے تھے۔ جس نے میری کلائی میں اس بری طرح سے کاٹ کھایا تھا۔ کئی اور تصویریں آئیں۔ ہر نئی تصویر میں وہ سنجیدہ اور مدبّر بنتی گئی۔ پھر سُنا کہ اس کی کہیں منگنی ہو گئی۔ اس کے خط آنے بند ہو گئے۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔

آج صبح موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے وقت میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ یونہی بیتی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔ بالکل ایسی ہی رنگین صبح تھی۔ شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ گلاب کے تختے سُرخ ہو رہے تھے۔ ہوا کے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلا رہے تھے۔ رنگ برنگ پرندوں کی سیٹیاں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے سامنے کھڑکی کی طرف دیکھا کہ شاید پردوں کے پیچھے کوئی نیلگوں آنکھوں اور سنہری بالوں والی گڑیا میرا مُنہ چڑا رہی ہو اور باہر ہاتھ نکال کر زور سے کہہ دے۔

"ڈرپوک!"

ساڑھے چھ بجے

ٹن سے گھنٹی بجی اور میں تھک کر اپنے کارنر میں سٹول پر آ گرا۔ یار لوگوں نے مالش شروع کی۔ بولے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ابھی دو راؤنڈ اور ہیں۔ ہمّت سے کام لو۔ ایک آدھ ہُک جما دینا اور جیت یقینی ہے۔ پہلے راؤنڈ میں یہی ہوا کرتا ہے۔

اور میں دل ہی دل میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا۔ جب میں نے چچا جان کے سامنے خواہ مخواہ ٹورنامنٹ کا ذکر کر دیا۔ اگر وہ یہاں نہ ہوتے تب کسی چیز کی پرواہ نہ ہوتی لیکن اب تو وہ بغور ملاحظہ فرمارہے ہوں گے اور شاید تبصرہ بھی کر رہے ہوں۔ اِدھر وہ پرنسپل صاحب۔ نہ جانے وہ کہاں سے آ ٹپکے۔ اگر ان سے واقفیت ہونی تھی تو ضرور اسی طرح ہونی تھی کیا؟ ہم بھی قسمت کے دھنی ہیں۔ اب وہ دونوں ہنس رہے ہوں گے۔

کل یونہی مُنہ سے نکل گیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ کہاں ملوگے؟ میں نے کہہ دیا جناب کل تو باکسنگ کا میچ ہے۔ بولے اچھا ہم میچ دیکھنے آئیں گے۔ تم نے ایک عرصہ سے ہمیں تنگ کرر کھاہے۔ اس مرتبہ ضرور تمہیں لڑتے دیکھیں گے۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ بہتیری مِنّتیں کیں۔ آپ وہاں تشریف نہ لایئے شور مچتا ہے۔ فضول ساٹورنامنٹ ہے۔ آپ کو ہرگز پسند نہ آئے گا۔ وقت ضائع ہو گا آپ کا، میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن کیا مجال جو وہ مانے ہوں۔ ادھر یہ پرنسپل صاحب بھی شامتِ اعمال سے تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے کہ ہم بھی ضرور دیکھیں گے۔

کوئی مقابلہ ہوتا تو بات بھی تھی۔ میرا مقابل ایک بھاری بھرکم سیاہ فام گینڈا تھا جس کے سامنے مجھے کم از کم زرہ بکتر پہن کر آنا چاہیے تھا۔ سوچ رہا تھا کہ یہ تو وزن میں کم از کم ایک دو من زیادہ ہو گا۔ آخر کس طرح مجھ سے اسے لڑا رہے ہیں؟ آتے ہی اس نے وہ الٹے سیدھے ہاتھ دیئے کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرشِ بریں تک کے تمام چھوٹے بڑے تارے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور اس کے بعد تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ مُنہ بنا کر دانت بھینچ کر جو چھلانگ مارتا تو دھا دھم پندرہ بیس مُکّے یکمشت ہی لگا جاتا اور سوچا وہ جاتا کہ کیا کروں؟

اچھے پھنسے ! اب تو نجات مشکل ہے۔ کہیں ناٹ آؤٹ نہ ہو جائیں اور ساری شیخی دھری رہ جائے۔

خیر دوسرا راؤنڈ شروع ہوا اور میں نے مدافعت شروع کر دی۔ بازو موڑ کر چہرے کے دونوں طرف آڑ بنالی۔ اب وہ ہے کہ مُکّے لگا رہا ہے اور میں روک رہا ہوں۔ اس طرح بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ پھر خیال آیا کہ میں اس سے کہیں ہلکا ہوں۔ ذرا سی ہمّت کریں تو اسے تھکا لوں گا۔ اب میں نے قلانچیں بھرنی شروع کیں۔ ایک مُکّا دیا اور تڑپ کر برابر سے نکل گیا۔ جتنے میں وہ مُڑا ہے اتنے میں ایک اور جڑ دیا اور پھر تیزی سے دوسری طرف دوڑ گیا۔ یہ نسخہ بہت کارآمد ثابت ہوا۔ اس پر تھکاوٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ سینہ ہے کہ دھونکنی بنا ہوا ہے۔ بازو لٹک رہے ہیں۔ ٹانگیں کانپ رہی ہیں۔ اس راؤنڈ میں مَیں نے اسے بالکل تھکا مارا۔ ریفری نے مجھے ٹوکا بھی کہ یہ کیا کبڈی سی کھیل رہے ہو؟ تیسرے راؤنڈ میں اسے اچھی طرح زدوکوب کیا، جو جو حربے یاد تھے اور جس جس اسٹائل کا ذکر کتابوں میں پڑھا تھا ان کے مطابق اس کی مرمّت کی۔ جب کبھی دھم سے اس کی لہراتی ہوئی ملائم توند پر مُکّا لگتا تو قہقہوں کا شور مچتا اور خوب تالیاں بجتیں۔ سب سے زوردار اور دیرپا قہقہہ پرنسپل صاحب کا تھا جو فضا کو زیر

و زبر کر دیتا۔ میں نے اسے جلدی ناک آؤٹ نہیں کیا کیونکہ اس کی توند پر مُکّا لگنے سے نہایت پیاری اور ترنّم خیز آواز نکلتی تھی جس سے تماشائی کافی خوش ہوتے تھے۔ راؤنڈ ختم ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا مُکّا بلکہ "مُکّی" لگا کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

ہمارے کالج کے لڑکے چھلانگیں مار کر رِنگ میں آ گئے۔ بڑا شور مچا۔ پھر میں چچا جان اور پرنسپل صاحب سے ملا۔ پرنسپل صاحب نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے بولے۔ "تم نے بڑی ہمّت سے کام لیا اور اس نے کمال رعونت سے۔ میں تمہاری وجاہت کو دیکھتا تھا، کبھی اس کی جہالت کو۔ تمہاری مدافعت بھی ظرافت سے پُر تھی جس سے شرارت ٹپکتی تھی۔"

مَیں نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "افسوس کہ میں نے امانت میں خیانت کر لی۔" وہ قہقہہ لگا کر بولے۔ "کیا لیاقت ہے؟"

یہ تھی پرنسپل صاحب سے پہلی ملاقات۔

ایک شام کو پاؤں پھیلا کر اور سر کرسی کی پشت پر ٹکا کر مزے سے پکچر دیکھ رہا تھا۔ انٹرول میں ایک خاتون نظر آئیں جو اپنے ننھے بہن بھائیوں کے ساتھ بالکل

قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ بیرے کو بلانا چاہتی تھیں۔ کسی چیز کے لیے بچے ضد کر رہے تھے شاید۔ لیکن ان کی آواز یا ہاتھ کا اشارہ بیرے تک نہ پہنچ سکا۔ آس پاس اور کوئی نہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے میری طرف دیکھا کہ میں سے بلا دوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ سلگا کر کش لگانے لگا۔ بھلا مجھے کیا پڑی جو کسی کو بلاتا پھروں۔ نہ جانے ایسی کیا اشد ضرورت تھی کہ انہوں نے پھر اسے بلانے کی کوشش کی اور پھر میری جانب دیکھا۔ میں نے جواباً تین چار عمدہ کش لگائے اور دھوئیں کے چھلّے بنانے لگا۔ وہ کچھ ناراض سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن اس کے بعد میں اکثر انہیں دیکھا کرتا۔ جب علی الصبح کالج جاتا تو ایک چوک میں کبھی کبھی نظر آئیں۔ ایک لمبی سی چمکیلی کار میں۔ شاید کہیں آس پاس ان کا کالج تھا۔

ایک مرتبہ میں نے اسی چوک میں اپنے بالوں پر بیٹھی ہوئی مکھی کو اُڑا دیا۔ وہ سمجھیں سلام کر رہا ہے۔ انہوں نے جواب میں مجھے بُری طرح دیکھا۔ اگلے روز پھر میرا ہاتھ یونہی ہل گیا۔ انہوں نے بہت بُرا منایا۔ میں نے جلدی سے بالکل ان کی نقل اتاری۔ اس کے بعد تو جان بوجھ کر میں نے سلام کرنا شروع کر دیا۔ خفا ہوئیں، مُنہ پھیرا، مُنہ چڑایا، چپ رہیں۔ لیکن آخر راہِ راست پر آ گئیں۔ اب

میرے سلام کا جواب تو نہ ملتا تھا لیکن بس مُسکرا دیتیں۔ آہستہ آہستہ اچھی لگنے لگیں اور میں ان کا انتظار کرنے لگا۔ ان کی کار کا نمبر میری ڈائری میں محفوظ تھا۔ ایک روز تو میں بہت ڈرا کہ کہیں ان سے محبّت نہ ہو جائے۔

پرنسپل صاحب سے دوسری ملاقات کنسرٹ میں ہوئی۔ ہم کلب میں کنسرٹ کر رہے تھے۔ پروگرام کے ایک حصّے میں قریشی صاحب اور مسز قریشی کی نقل اتاری گئی۔ دونوں میاں بیوی حد درجے کے قنوطی تھے۔ جب دیکھو بُور رہے ہیں (اور جب نہ دیکھو تب بھی بُور رہے ہیں) شیطان کا خیال تھا کہ ان کا ہاضمہ خراب ہے۔ میں کہتا تھا کہ یہ ورزش نہیں کرتے اس لیے ایسے ہیں۔ دو سال کے عرصے میں ہم نے انہیں صرف تین مرتبہ مُسکراتے دیکھا۔ وہ بھی ایسے موقعوں پر جب لوگوں ہنستے ہنستے بیہوش ہو گئے تھے۔ تب وہ دونوں اس بیزاری سے مُسکرائے تھے جیسے سب پر بہت بڑا احسان کر رہے ہوں۔ قریشی صاحب کا پارٹ میں کر رہا تھا اور مسز قریشی شیطان تھے۔ سانولے ہونے کی وجہ سے ان پر پاؤ بھر پاؤڈر ضائع کیا تھا۔ وہ کہتے تھے (یا کہتی تھی) کہ میں سفید کپڑے پہنوں گا جیسے کہ اکثر مسز قریشی پہنتی تھیں۔ میں نے علیحدہ لے جا کر بتایا کہ ایک بالکل سیاہ انسان سفید کپڑے پہنے جا رہا تھا۔ اُدھر سے ایک ننھا سا بچّہ اپنے باپ کے

ساتھ آرہا تھا جو فوٹو گرافر تھے۔ بچّہ اس شخص کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اپنے والد سے بولا "وہ دیکھئے ابّا جان ایک Negative جا رہا ہے۔" اس پر ان کے کان کھڑے ہوئے اور وہ باز آ گئے۔

شیطان دُبلے پتلے تھے۔ چونکہ ان کا قد مجھ جتنا تھا اس لیے انہیں نیچی کرسی پر بٹھایا گیا تھا تاکہ چھوٹے لگیں۔ قریشی صاحب مُنہ لٹکائے کوئی بیماریوں کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ دوسری طرف چہرہ پھُلائے ہوئے مسز قریشی بالکل بیزار بیٹھی ہیں۔ سامنے کتابوں کا ڈھیر لگا ہے۔ ایک کتاب اٹھاتی ہیں اور دُور پھینک دیتی ہیں۔ پھر بیزار ہو کر بیٹھ جاتی ہیں۔ قریشی زور سے کھانستے ہیں۔ مسز قریشی چونک پڑتی ہیں۔

"یہ کم بخت زکام مجھے دبوچ بیٹھا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے تو ورمِ جگر رفع ہوا تھا۔" وہ بولیں۔

"اور مجھے کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ اِدھر گلا ہے کہ الگ پکا دھرا ہے۔" قریشی بولے۔ "آج پھر میری پسلی میں درد ہو رہا ہے۔"

"میری بائیں آنکھ رہ رہ کر پھڑک رہی ہے۔ خدا خیر کرے۔"

”رات گرمی کس قدر تھی؟“

”اور مچھروں نے بھی قسم کھا رکھی تھی کہ آج ہی کاٹیں گے۔“ وہ بولے۔

”آج کا دن کتنا پھیکا اور غمگین ہے۔“

”اور رات کس قدر اداس اور ڈراؤنی تھی؟ کتنے تارے ٹوٹے ہیں۔ توبہ الٰہی!“

(طویل خاموشی)

”سُنا ہے امریکہ کے شمالی حصّے میں بڑا زبردست زلزلہ آیا ہے۔ حالات کتنے خطرناک ہوتے جارہے ہیں۔“ مسز بولیں۔

”اور آسٹریلیا کے جنوبی ساحل پر بڑا سخت طوفان آیا ہے جس سے لوگ بہت سہمے ہوئے ہیں۔“

”میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ عنقریب دنیا سے کوئی سیارہ ٹکرائے گا اور بیچاری دنیا چکنا چور ہو جائے گی۔ کیسی کیسی مصیبتیں نازل ہونے والی ہیں۔“

”مجھے بھی ہفتہ بھر سے طرح طرح کے ڈراؤنے خواب آرہے ہیں۔ رات تو ایک لمبے سے اُونٹ نے مجھے نگل ہی لیا تھا۔“

(ایک اور وقفہ)

باہر سے نوکر کے ہنسنے کی آواز آتی ہے۔ مسز قریشی کی تیوری چڑھ جاتی ہے۔ ہاتھ پیروں میں تشنّج سا آجاتا ہے جیسے ابھی کوئی دورہ پڑے گا۔ غصّے سے کہتی ہیں۔ ''یہ کم بخت ہر وقت ہنستا رہتا ہے۔ شاید اسے موت یاد نہیں۔''

''جو زیادہ ہنستے ہیں وہ روتے بھی ہیں۔ ان شاء اللہ جلد مصیبت میں گرفتار ہو گا۔ بھول جائے گا سب چوکڑی۔''

لوگ ہنس رہے تھے اتنے میں ایک خاص قسم کے فلک شگاف قہقہے کی آواز آئی۔ چوکنّا ہو کر جو دیکھتا ہوں تو سامنے پرنسپل صاحب بیٹھے ہیں۔ ان کی نوک دار مونچھیں بجلی کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ مونچھیں حسبِ معمول تاؤ شدہ تھیں اور یوں اُوپر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جیسے گھڑی کی سوئیاں گیارہ بج کر پانچ منٹ پر ہوتی ہیں۔

ان کے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ غور سے دیکھا تو یہ وہی تھیں جن سے ہر روز چوک میں جھڑپ ہوتی تھی۔ میں بالکل گھبرا گیا۔ کچھ اپنا پارٹ بھی پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اور پرامپٹر کے سہارے کام چل رہا تھا۔ اب انہیں دیکھ کر

اِدھر اُدھر کی ہانکی شروع کر دیں۔ فقرے غلط سلط بول رہا تھا۔ یہ غالباً پرنسپل صاحب کی صاحبزادی ہوں گی یا بھتیجی وغیرہ ہوں۔ یا شاید یونہی اتفاقیہ طور پر بیٹھ گئی ہوں۔ عجب مصیبت ہے۔ میں ہوں کہ بہک رہا ہوں، پرامپٹر چیخ چیخ کر پارٹ بتارہاہے۔ اس کی آواز لوگ سُن رہے ہیں اور خوب ہنس رہے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ معاملہ کیا ہے۔ شاید اس لیے ہنس رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسی طرح ہوتا تھا۔ ادھر پرنسپل صاحب کے فلک شگاف قہقہوں سے فضا کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں۔ ابھی یہ ڈراما تہائی بھی ختم نہ ہوا تھا کہ مجبوراً پردہ گرادیا گیا۔ اسٹیج پر کسی صاحب کو وائلن دے کر بھیج دیا گیا۔ لڑکوں نے جھنجھوڑ ڈالا، دھمکایا، چمکارا، منّتیں کیں لیکن میں مچل گیا کہ اب اس اسٹیج پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اپنے پارٹ یاد نہیں۔ باہر لوگ شور مچا رہے تھے۔ آخر تنگ آکر شیطان بولے۔ ”تمہاری سزا یہ ہے کہ تم خود اسٹیج پر جا کر کہو کہ مجھے معاف کیجئے۔ میں اپنا پارٹ بھول گیا ہوں۔“

انہوں نے دھکیل کر مجھے اسٹیج پر لا کھڑا کیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر یکایک کچھ سوجھ گیا اور میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”خواتین و حضرات! یہ جو کچھ آپ نے دیکھا محض نمونہ تھا جسے عموماً ٹریلر کہا جاتا ہے۔ پورا ڈرامہ آپ

کو پھر کبھی دکھایا جائے گا۔ اسی ٹریلر سے اندازلگا لیجئے کہ اصل چیز کتنی زوردار ہو گی۔"

لوگ ہنسنے لگے۔ لیکن پرنسپل صاحب کے بلند اور دیرپا قہقہے سارے غل غپاڑے پر فوقیت رکھتے تھے اور ان کی مونچھیں بجلی کی روشنی میں بہت پیاری لگ رہی تھیں۔

آخر میں نے شیطان کو ساری بات بتادی۔ وہ بہت ہنسے۔

پھر پوچھنے لگے۔ "کیا واقعی تمہیں محبّت ہو گئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں کچھ کچھ ہو گئی ہے؟"

بولے "ان کا نام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پتہ نہیں۔"

پوچھا "رہتی کہاں ہیں؟"

"یہ بھی پتہ نہیں، البتہ ان کی کار کا نمبر زبانی یاد ہے۔"

"کبھی بات کی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے سچ کہہ دیا۔

"ان کے ابّا کی تعریف؟"

"اچھی طرح تو پتہ نہیں، لیکن کچھ اندیشہ سا ہے کہ کہیں پرنسپل صاحب ہی نہ ہوں۔"

بولے۔ "حد ہو گئی! اندیشہ سا ہے؟ اور جو پرنسپل صاحب نہ ہوئے پھر؟ تم تو فرہاد وغیرہ کی قسم کے انسانوں کو بھی مات کر گئے۔ ایسا عشق تو ہوا کرتا تھا، کہیں سن سولہ سو۔۔۔ سولہ سو پچیس میں! یہ خواہ مخواہ کی محبّت تب ہوا کرتی تھی جب مشرق میں لڑکیاں نہیں تھیں۔ میرا مطلب ہے سارا دن چھپی بیٹھی رہتی تھیں، کہیں کسی کو اتفاق سے دیکھ پایا اور فوراً محبّت شروع کر دی اور اب۔۔۔۔ آج کل تو خدا کا فضل ہے۔ اِس زمانے میں اس قسم کے دقیانوسی خیالات بالکل بے موسے ہیں۔"

"مجھے تو ہر رات ان کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ خوابوں میں ان سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔"

"خوب! تو خواب دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں تمہارا قصور نہیں۔ اگر رات کو دستر خوان پر ذرا دیر لگا دی جائے تو پھر خواب نہیں نظر آئیں گے تو اور کیا ہو گا؟ ذرا بھوک رکھ کر کھایا کرو، تب دیکھیں گے کیا نظر آتا ہے۔ مجھے تو سو کر ذرا سُدھ نہیں رہتی۔ صبح حجّام ہی جگاتا ہے، کبھی پریاں نہیں جگاتیں۔" وہ بولے۔

"آج کل تو تقریباً ہر روز انہیں دیکھتا ہوں۔۔۔ اسی چوک میں۔۔۔ وہ مجھے دیکھ کر مُسکرایا کرتی ہیں۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔!"

"تمہاری ہی ہمّت ہے جو اتنی گرمیوں میں محبّت کا نام لیتے ہو۔ مجھے تو ان دنوں محبّت کا ذکر سنتے ہی پسینہ آجاتا ہے۔ میری مانو تو اپنی اس عجیب و غریب محبّت کو تھوڑے دنوں کے لیے ملتوی کر دو۔ تین چار مہینوں کی بات ہے۔ موسم خوشگوار ہو جائے گا تب جو مرضی آئے کرنا۔"

مَیں نے ایک لمبی آہ بھری اور چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔ "روفی! تم کیسی باتیں کر رہے ہو آج؟ محبّت بھی کہیں ملتوی ہوئی ہے بھلا؟۔۔۔ عشق پر زور نہیں ہے۔ یہ وہ آتش غالب۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"میرا ذاتی نظریہ تو یہی ہے کہ ایک تندرست انسان کو محبّت کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ آخر کوئی تُک بھی ہے اس میں؟ خواہ مخواہ کسی کے متعلق سوچتے ہو خواہ وہ تمہیں جانتا ہی نہ ہو۔ بھلا کس فارمولے سے ثابت ہوتا ہے کہ جسے تم چاہو وہ بھی تمہیں چاہے۔ میں یہ سب من گھڑت قصّے ہیں۔ اگر جان بوجھ کر خبطی بننا چاہتے ہو تو بسم اللہ کیے جاؤ محبّت۔ ہماری رائے تو یہی ہے کہ صبر کر لو۔"

مجھے غصّہ آ گیا۔ یہ شخص ہمیشہ مسخرہ بنا رہتا ہے۔

"تم بالکل خشک انسان ہو، بلکہ گرم خشک۔ بالکل غیر رومانی قسم کے۔ تم سے ایسی باتیں کرنی فضول ہیں۔ تم ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔" مَیں نے جھلّا کر کہا۔

"اور تم بہت سمجھ سکتے ہو۔ کم از کم تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایک چھ فٹ کے تندرست انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ محبّت کرے اور اس صورت میں جبکہ وہ صبح سے شام تک ورزش کرتا ہو۔ تمہاری صحت ہرگز محبّت کے قابل نہیں۔ تم تو جا کر ورزش کرو۔" میں غصّے سے تلملا اٹھا اور بغیر ایک لفظ کے واپس چلا آیا۔

یکایک وہ خاتون غائب ہو گئیں۔ اگلے ہفتے پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے اور وہ خاتون واقعی ان کی صاحبزادی تھیں۔ بڑا افسوس ہوا۔ دن بھر سوچتا رہا اگر پتہ ہوتا کہ یہ ان کی صاحبزادی ہیں تو یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھا رہتا۔ اب تو وہ سب کہیں دور چلے گئے ہوں گے۔ شیطان کے پاس گیا۔ ساری بات بتائی اور پوچھا کہ اب کیا کیا جائے؟

وہ بولے۔ "بھلے آدمی! عقل کے ناخن لے۔ نہ کبھی بات کی تھی نہ کچھ اور خواہ مخواہ افسوس کرنے سے فائدہ؟ دنیا بہت وسیع ہے اور حادثے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کیا پتہ کل تجھے کوئی اور چیز نظر آجائے اس سے بہتر۔ باقی رہا تبادلہ سو اس پر کسی کا زور نہیں، یہ دنیا کا دستور ہے۔ ہم نے صبر کیا تو بھی کر۔ انّا لِلّٰہ و انّا۔۔۔"

"آہ پرنسپل صاحب!" میں نے ایک سرد آہ بھری۔ ان دنوں سرد اور گرم دونوں آہیں بڑی آسانی سے بھر سکتا تھا۔ کافی پریکٹس تھی۔

"اب آہ پرنسپل صاحب یا ہائے پرنسپل صاحب کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ پرنسپل صاحب کی ذات سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ویسے وہ کچھ اتنے دُور

بھی نہیں گئے اور اگر تم ان کی نگاہوں میں آ گئے ہو تو وہ تمہیں نہیں بھولیں گے اور شاید کبھی یاد ہی فرمالیں۔"

میں سوچنے لگا شاید یار ہی فرمالیں۔

اور سچ مچ انہوں نے یاد فرمالیا۔ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں مدعو کیا اور یہ بھی لکھا کہ کوٹھی میں کافی جگہ ہے۔ میرے پاس ٹھہرنا۔

میں بہت خوش ہوا۔ اس روز خوب اکڑ کر چلا۔ مٹھیاں بھینچ کر۔ سینہ نکال کر۔ میرے لبوں پر مُسکراہٹ تھی۔ اب بہت جلد ان خاتون کا اچھی طرح سے مُنہ چڑاؤں گا اور انہیں سلام کا جواب بھی دینا پڑے گا اور یہ کہ میں ایک ذمہ دار اور عقلمند لڑکا ہوں۔ لوگ مجھے بہت اچھا سمجھتے ہیں تبھی تو پرنسپل صاحب محض دو تین رتبہ دیکھنے کے بعد اتنے متاثر ہو گئے ورنہ شیطان بھی تو ہیں۔ سانولے رنگ کے شتر مرغ کی قسم کے انسان۔ چہرے پر نہ ذہانت ہے نہ کچھ اور بالکل کورے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں تو کسی نے پسند نہیں کیا۔ شاید پرنسپل صاحب اس شام کو مجھے لڑتا دیکھ کر خوش ہو گئے۔ انہوں نے ضرور میرا نام اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ بس مرعوب ہو گئے ہیں۔ ولایت میں تو کھلاڑیوں کی بہت قدر ہوتی ہے۔ کیا سپرٹ دکھائی ہے انہوں نے، واللہ اور پھر میں ہوں کس سے کم؟ ایم اے کا

طالب علم، ہمیشہ چوٹی کے لڑکوں میں شمار ہوتا ہوں۔ چند مہینوں میں ایم اے پاس کرلوں گا پھر مرکزی مقابلے کے امتحان میں شریک ہوں گا۔

تب سب کو پتہ چلے گا کہ میں محض ایک کھلاڑی ہی نہیں ہوں۔ مجھ میں کئی اور خوبیاں بھی ہیں جن کے سامنے پرنسپل صاحب جیسے نقّاد نے ہتھیار ڈال دیئے۔

میں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ پانچ روز کے بعد جانا تھا۔ متوقع گفتگو کی سکیم بنائی کہ وہ تقریباً کیسی کیسی باتیں کرسکتے ہیں اور ان کے دندان شکن جواب کیا کیا ہوسکتے ہیں۔ ان کے سامنے گھبرانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ سپورٹس مین کبھی گھبراتے ہیں کیا؟

شیطان نے بڑی بدتمیزی دکھائی کہ مبارک باد تک نہ دی۔ میں نے سوچا رشک آ رہاہو گا جناب کو۔ لیکن اتفاق سے جس شہر میں پرنسپل صاحب تھے وہیں شیطان چند دنوں کی چھٹیوں پر جا رہے تھے چنانچہ ہم اکٹھے روانہ ہوئے۔ میں نے دھاریوں والا بہت اچھے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور ویسے ہی رنگ کی پھولدار بولگا رکھی تھی۔ بو کچھ تنگ تھی اس کا ایک سخت سا حصّہ بُری طرح چبھ رہا تھا۔ میری گردن بالکل اکڑی ہوئی تھی۔ ذرا بھی ہلا نہ سکتا تھا۔ بار بار اسے ڈھیلا کرتا اور وہ گردن میں پھر پیوست ہو جاتی۔

شیطان بولے۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو اس کم بخت کو پھینک دوں ایک طرف، آخر کس حکیم نے کہا ہے کہ ضرور بولگائی جائے۔“ مجھے شبہ ہوا کہ حسد سے جل رہا ہے!

”اور اپنی طرف سے دل میں خوش ہو رہے ہو گئے کہ بڑے تیر مارنے جا رہے ہو۔“ وہ بولے۔ اور میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے شیطان کے عزیزوں کے ہاں ٹھہرنا پڑا۔ اگلے روز پرنسپل صاحب سے ملنا تھا۔ لباس کا انتخاب کرنے لگا اور شیطان کی رائے لی۔ وہ بولے۔ ”کچھ پہن لو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”فرق کیوں نہیں پڑے گا۔ میرے خیال میں تو یہ دھاریوں والا سوٹ اور یہ بو سب۔۔۔۔“

”خواہ نیکر پہن کر چلے جاؤ یا تہمد باندھ لو۔ اب کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”آخر کیوں نہیں پڑے گا؟ لباس کی تمیز بھی تو کوئی چیز ہے۔“

”لباس کا خیال چھوڑو، وہ پہلے سے فیصلہ کر چکے ہیں۔“

”تو گویا مجھے تفریحاً بلایا گیا ہے۔“

"یقیناً۔"

"روفی! تم ایک زود رنج اور چڑچڑے انسان ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تمہیں رشک آرہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ حسد سے تمہارا بُرا حال ہے۔"

اور انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"آخر ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں؟" میں نے پوچھا۔

"پرنسپل صاحب کو جو کچھ چاہیے وہ تمہارے ہاں موجود ہے۔ تمہارے ابّا کی تنخواہ کافی ہے۔ تمہارے ہاں اچھی سی کار ہے۔ تمہاری جائیداد بھی ہے اور بالکل مختصر سا کُنبہ ہے۔ بس ان سب باتوں کی جانچ پڑتال کے بعد پرنسپل صاحب راضی ہوگئے ہیں اور تم خواہ مخواہ پیچ میں تاؤ کھارہے ہو۔"

"لیکن کار تو ابّا کی ہے۔ اس سے میرا تعلق؟"

"کچھ بھی سمجھ لو لیکن انہیں تو یہی چاہیے تھا۔"

"اور اگر یہ سب باتیں ہم میں نہ ہوتیں تو؟"

''تو یہی کہ تم دن رات ٹکّے بازی کرتے۔ تیرنے میں کپوں کی گٹھڑی جیت لیتے، ایم اے چھوڑ کچھ اور بھی کر لیتے، تب بھی تمھیں کوئی نہ پوچھتا۔''

''جھوٹ ہے۔'' میں نے جوش سے کہا۔ ''بھلا ابّا کی چیزوں کا مجھ سے تعلق؟ میرے پاس تو اپنی قابلیت ہے، بلند ارادے ہیں، ہمّت ہے۔''

''تمہارے پاس سب کچھ ہو گا لیکن تمہارا انتخاب محض کار وغیرہ کی وجہ سے ہوا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں، عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔''

مجھے بڑا غصّہ آیا۔ جی چاہا کہ شیطان کو ناک آؤٹ کر دوں۔ یونہی انٹ سنٹ ہانک رہے ہیں۔ پرنسپل صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ نہایت وسیع خیالات کے انسان ہیں۔ تم ان پر اتنا بڑا الزام لگا رہے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مجھے محض میری خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔

''خیر تم مُصر ہو تو کرتے ہوں گے۔''

مجھے پھر غصہ آ گیا۔ ''آخر کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ثبوت؟۔۔۔ ثبوت یہی ہے کہ کل پرنسپل صاحب سے اپنے گھر کے متعلق ذرا اکھڑی اکھڑی باتیں تو کر کے دیکھو، پھر پتہ چل جائے گا۔''

”اور جو تمہاری باتیں غلط ثابت ہوئیں تو؟“

”تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔ عمر بھر تمہیں ایک نصیحت کر جاؤں تو نام بدل دینا۔“

میں سوچنے بیٹھ گیا۔ بتانے کی تو غلط باتیں بتا دوں، لیکن اس کے نتائج نہ جانے کیسے نکلیں۔ کہیں ابّا کو پتہ نہ چل جائے۔

”پرنسپل صاحب تو ابّا سے ملے ہوں گے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! صرف چچا جان سے ملے تھے۔ وہ بھی سرسری طور پر۔“

ذرا سی مزید بحث کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا کہ پرنسپل صاحب کو غلط باتیں بتاؤں گا۔ مجھے پختہ یقین تھا کہ وہ ان باتوں کا اتنا سا بھی خیال نہیں کریں گے۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں، بھلا اس میں موٹر اور جائیداد کا کیا سوال ہے۔

شیطان مجھ سے ہاتھ ملا کر بولے۔ ”آزمائش شرط ہے۔“

شام کو ان کے ہاں جانا تھا۔ میں نے وہی دھاریوں والا سوٹ پہنا۔ پھولدار بو لگائی جس نے میری گردن کو جکڑ کر رکھ دیا۔ پرنسپل صاحب نے اپنی کار بھیجی تھی۔ میں نے شیطان کو بھی ساتھ گھسیٹا کہ چلو تم بھی یہ تماشا دیکھ لو۔

مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ شیطان بہانے سے ان کی لائبریری میں گھس گئے جو ساتھ ہی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ تین ریڈیو رکھے تھے۔ ایک کو استعمال کرتے ہوں گے، دو شاید بگڑے ہوئے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے کتّے، بلّیاں، طوطے، بہت عجیب و غریب تصویریں۔۔ انگیٹھی، میزیں، الماریاں، سب کی سب ایسی چیزوں سے لدی ہوئی تھیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ آج ہی رکھا گیا ہے۔

خوشبو کی ایک زبردست لپٹ آئی اور پرنسپل صاحب داخل ہوئے۔ ایک بہت ہی چمکیلے سوٹ میں ملبوس، بال بہت اچھے بنے ہوئے تھے، بلکہ استری کیے گئے تھے۔ ان کی دونوں نوکدار بڑھیا مونچھیں بجلی کی تیز روشنی میں نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی تھیں۔ وہ حسبِ معمول چھت کی جانب اشارہ کر رہی تھیں جیسے کسی ٹائم پیس میں گیارہ بج کر پانچ منٹ ہوئے ہوں۔ نہ جانے انہوں نے روغن مونچھ استعمال کیا تھا یا کوئی اور خاص مونچھ کریم لگا کر آئے تھے۔

مجھے دیکھ کر تو وہ جیسے آپے سے باہر ہو گئے۔ مُسکرائے، ہنسے، چلّائے، میرے ہاتھ کو دس ہارس پاور سے یوں بھینچا کہ جیسے توڑ کر دم لیں گے۔ ان کا میک اپ دیکھ دیکھ کر میں حیران ہو رہا تھا۔ بھلا یہ انٹرویو کس کا ہو رہا ہے۔ میرا یا اُن کا؟

بولے "کم از کم ایک ماہ تو تم یہاں ضرور ٹھہرو گے۔ نہیں؟ واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تمھیں جانے کون دیتا ہے۔ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔ غیر حاضری لگے گی؟ لگ جانے کیا پروا ہے؟ کھیلنے کے لیے یہاں بے شمار کلب ہیں۔ کرکٹ ہے، باکسنگ ہے، ٹینس ہے، سب کچھ ہے۔"

جس تیز رفتاری سے یہ باتیں کر رہے تھے۔ میں ان سے مرعوب ہوتا جا رہا تھا وہ کم بخت بو گردن میں بُری طرح چبھ رہی تھی۔ اسے ٹھیک کرتے کرتے تنگ آ چلا تھا۔

"میں نے چھ بُرجی کلب میں تمھیں کھیلتے دیکھا۔ پروفیسر گراؤچو تمھاری بڑی تعریف کر رہے تھے۔ اخباروں میں کتنی مرتبہ تمھارے متعلق پڑھا۔ خوب! تو ایم اے کا امتحان دے رہے ہو۔ ہم نے تمھاری لیاقت کی شہرت بھی سنی ہے۔ یہ ساری خوبیاں تم میں اکٹھی کیسے ہو گئیں؟ ایم اے کوئی مذاق تھوڑا ہی ہے اور

پھر ذہین لڑکے تو کھیلنے میں عموماً پھسڈی ہوتے ہیں۔ نہ جانے تم یہ سب کچھ کس طرح کر لیتے ہو؟"

انہوں نے جوش میں آکر میرے کندھے مَسل ڈالے۔

میں سوچنے لگا کہ شیطان بالکل جھوٹ بولتے تھے۔ پرنسپل صاحب تو میری خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ بھلا انہوں نے ہمارے گھر کے متعلق بھی پوچھا ہے کہیں؟ مجھے شرمندہ ہونا چاہیے۔ توبہ توبہ کیسی کیسی فضول باتیں میں ان سے منسوب کرتا رہا ہوں۔ استغفر اللہ!

"تو کم از کم ایک ماہ یہاں رہو گئے۔ مجھے تو فقط دو مرتبہ کار کی ضرورت پڑتی ہے۔ دن بھر یہ یونہی کھڑی رہتی ہے۔ تم اسے خوب لیے پھرنا۔ یہ کار کیسی ہے؟ یہی جس میں تم آئے ہو۔ بیوک کا نیا ماڈل ہے۔ پہلے ہمارے ہاں ڈاج تھی۔ وہ اچھی نہ تھی۔ جی چاہا کہ پونٹیک لے لوں۔ سٹوڈی بیکر پر بھی دل للچایا، بڑی عمدہ کار ہوتی ہے، لیکن آخر یہی لے لی۔ بھلا تمہارے ہاں کون سی کار ہے؟" میں چونک پڑا۔ سوچنے لگا کہ اب کیا کہوں۔ بو زور سے چُبھی۔ میں نے جلدی سے اسے ٹھیک کیا پھر عجب سا مُنہ بنا کر کہا "ہمارے ہاں؟۔۔۔۔۔ ہمارے ہاں تو کوئی کار نہیں۔"

”کیا کہا؟۔۔۔۔کوئی کار نہیں؟“

”جی نہیں، ہمارے ہاں کوئی کار تھی ہی نہیں، البتہ مربعوں پر چند اُونٹ ضرور ہیں؟“

”لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔“ انہوں نے یوں مُنہ بنایا کہ جیسے بچّے کونین مکسچر پی کر بنایا کرتے ہیں۔

”جی ہاں کسی نے غلط بتادیا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

ان کی دونوں تنی ہوئی تاؤ شدہ مونچھیں یک لخت ڈھیلی پڑ گئیں اور اب وہ بالکل خطِ مستقیم بنا رہی تھیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں سوا نو بجے ہوتی ہیں۔

”آپ خاموش ہو گئے۔“ میں نے مؤدبانہ کہا۔ ”کیا ہوا کار ہوئی نہ ہوئی اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”ہاں! ہاں کوئی بات نہیں۔ یہ تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ لیکن مجھے کسی نے بتایا کہ تمہارے ہاں کار ہے۔ خیر!“

ان کا جوش و خروش کچھ کم ہو گیا تھا۔ اپنی انگلیاں چٹخانے لگے۔ پھر بولے ”آج کل ابّا کہاں ہیں؟“

”پنشن ہو گئی ہے۔ کشمیر گئے ہوئے ہیں۔“ حالانکہ پنشن ملنے میں ابھی کئی سال باقی تھے۔

”اُفّوہ! پنشن پر ہیں۔ لیکن مجھ سے کسی نے کہا تھا ابھی سروس میں ہیں۔“

”یونہی کسی نے کہہ دیا ہو گا۔“

پرنسپل صاحب نے پھر بہت بُرا مُنہ بنایا۔

”اور ہاں تمہاری زمینیں۔۔۔۔۔؟“

”اچھا ماموں جان کے مربعوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ دراصل وہ ہمارے نہیں، ساری جائیداد ماموں جان کی ہے۔“

”وہ زمینیں بھی تمہاری نہیں۔“ وہ چلّا کر بولے۔ ”غضب خدا کا۔ تو کیا سچ مچ وہ کسی اور کی ہیں؟“

”جی ہاں! سچ مچ۔ نہ جانے کس نے آپ کو ساری باتیں غلط بتا دیں؟“

”لا حول ولا قوۃ! کار والی بات بھی غلط۔ سروس والی بات بھی غلط۔ جائیداد والی بات بھی غلط، لاحول ولا قوۃ!“

”مَیں اس مرتبہ ایم اے کے امتحان کی تیاری!“ مَیں نے شروع کیا۔

”لا حول و لا۔۔ ابھی ایم اے کے امتحان میں بڑے دن ہیں، اسے چھوڑو۔ تمہارے چھوٹے بھائی کہاں ہیں آج کل؟“

”کون سے چھوٹے بھائی کا ذکر کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”لاحول ولا۔۔۔۔۔ تمہارے چھوٹے بھائی کا!“

”جناب ہم کل آٹھ بھائی ہیں!“ میں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

انہوں نے ایک چیخ سی ماری۔ ”آٹھ بھائی؟ لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ۔۔۔ (زور سے) تو گویا سچ مچ آٹھ بھائی ہیں۔۔۔ اور کار والی بات بھی غلط ہے؟۔۔۔۔ لا حول ولا قوۃ۔“

پرنسپل صاحب کا چہرہ دفعتاً اُتر گیا۔ ان کی چمک دار مونچھیں اور نرم ہو گئیں اور یکلخت ڈھلک سی گئیں، جیسے گھڑی کی سوئیاں آٹھ بج کر بیس منٹ پر ہوتی ہیں۔

"تو گویا مجھے بالکل غلط باتیں بتائی گئی ہیں۔ یقین نہیں آتا۔۔۔۔ لا حول و لا۔۔۔ سچ مچ تمہارے ہاں کار نہیں؟ عجب تماشا ہے۔ مجھے تو بڑے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ۔"

"قبلہ گستاخی معاف! آپ پانچ منٹ میں سات آٹھ مرتبہ لاحول پڑھ گئے ہیں!"

"اوہو! خیال نہیں رہا لیکن سوچو تو سہی ذرا، سب کی سب باتیں غلط بتائی گئیں۔"

پرنسپل صاحب نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

مَیں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "آپ بُرا نہ مانیے، مجھ میں نقائص نکالیے۔ بھلا ابّا جان کی کار ہو یا ان کی جائیداد اس سے میری خوبیوں میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ میں ایم اے کا امتحان دینے والا ہوں ضرور پاس ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد کئی مقابلوں میں شامل ہو سکتا ہوں، ابھی ابھی آپ نے مجھے ذہین کہا ہے۔ میرے ارادے بلند ہیں۔ مجھ میں ہمّت ہے۔ آپ میرے پرانے سرٹیفکیٹ دیکھ لیجیے اور وہ۔۔۔۔۔!"

"ہاں ہاں یہ سب ٹھیک ہے۔ خُدا کرے تم کامیاب ہو جاؤ۔ لیکن مجھے تو ایک معتبر ذریعے سے معلوم ہوا تھا کہ تمہارے ہاں۔۔۔۔۔ ویسے تم بھی سچ کہہ رہے ہو۔ لیکن وہ۔۔۔۔۔۔۔ یعنی کہ۔۔۔۔۔ مجھے سچ مچ غلط بتایا گیا۔"

"آپ کار کا ذکر بار بار کرتے ہیں، سو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ چند ہی سالوں میں ایک چھوڑ دو کاریں لے لوں گا اور وہ میری ہوں گی۔ آپ میرے متعلق بھی تو کچھ پوچھئے۔ آپ نے اکثر اخباروں میں میرے متعلق پڑھا ہو گا۔"

"اسے چھوڑ۔ کھیل کود بے کار چیز ہے۔ اور یہ ڈراما وغیرہ مسخروں کا کام ہے۔ باقی رہا ایم اے میں پڑھنا، سو یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ ہزاروں لڑکے ایم اے میں پڑھتے ہیں۔" وہ بیزار ہو کر بولے۔

"لیکن جناب میرے پاس حوصلہ، اُمّیدیں ہیں، مستقل مزاجی ہے، بلند ارادے ہیں۔"

"ہوں گے! خدا کرے ہوں! نہ جانے مجھے یہ باتیں کیوں غلط بتائی گئیں۔ اگر کہیں مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ تمہارے ہاں۔۔۔۔۔"

اس کے بعد وہ کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلے۔ انہوں نے ایک سگریٹ پیا (اکیلے اکیلے) کچھ دیر سَر جھکائے سوچتے رہے۔ تین چار مرتبہ مجھے دیکھا بھی۔ دیر تک مراقبے میں رہے، پھر بولے۔ ''مَیں کل کہیں باہر جارہا ہوں۔ بڑا ضروری کام ہے۔ کئی روز تک نہ آسکوں گا۔ تم یہاں اکیلے اداس ہو جاؤ گے۔ ویسے تمہارا ارادہ کب ہے واپس جانے کا؟''

''چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔!''

''ہاں مَیں کم از کم ہفتہ بھر باہر رہوں گا۔ یہاں ننھا ہو گا۔ اس سے تمہارا کیا جی بہلے گا۔ پھر تمہاری غیر حاضریاں بھی لگ رہی ہیں۔ اچھا تو بہت دیر ہو گئی کہو تو موٹر نکلوا دوں۔ ویسے راستہ لمبا تو نہیں ہے، کل دس پندرہ منٹ کا ہے۔ میرے خیال میں پیدل بہتر رہے گا۔''

''اچھا!''

انہوں نے ایک ڈھیلا سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہاتھ ملا کر بلکہ ہاتھ چھُوا کر میں نے مؤدبانہ سلام عرض کیا اور چل پڑا۔

دروازے سے مُڑ کر جو دیکھتا ہوں تو وہ دونوں نوکدار مونچھیں بالکل لٹک رہی تھیں۔

پرنسپل صاحب کی بڑھیا مونچھوں میں ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

دروازے پر شیطان ملے۔ ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلنے لگے۔ بو ایک مرتبہ پھر چُبھی، اس دفعہ میں نے اسے نوچ کر پرنسپل صاحب کے لان میں پھینک دیا۔ کوٹھی کے دروازے پر شیطان نے ایک زبردست فلک شگاف قہقہہ لگایا اور مجھے بھی ان کا ساتھ دینا پڑا۔ ہم کتنے زور سے ہنسے؟ اس کا اندازہ تو نہیں، البتہ آس پاس کے درختوں پر جتنے پرندے بسیرا کر رہے تھے وہ سب کے سب اُڑ گئے۔

ان باتوں کو ایک عرصہ گزر گیا ہے۔ اب کسی چوک میں گزرتی ہوئی کار کو دیکھ کر ہر گز نہیں ٹھہرتا۔ کسی خاتون کو دیکھ کر اگر میرے بالوں پر مکھی بیٹھی بھی ہو تب بھی نہیں اُڑاتا۔ نہ کبھی کسی خاتون کو سلام کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ رات کو ہمیشہ بھوک رکھ کر سوتا ہوں۔

اور جب کبھی کھیل کود کے بعد زیادہ تھک جاتا ہوں تو آنکھیں مندنے لگتی ہیں، غنودگی سی طاری ہو جاتی ہے۔ پرانی یادیں تازہ ہونے لگتی ہیں۔ نظروں کے سامنے سیاہی اور سفیدی کے ٹکڑے ناچنے لگتے ہیں۔ کچھ تصویریں بن جاتی ہیں۔ پھر وہ متحرک ہو جاتی ہیں۔

تب سامنے رکھے ہوئے ٹائم پیس کے گرد ایک ہالہ بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی شام کو ساڑھے چھ بجے ایک جوڑی بڑھیا، نوکدار، چمکیلی تاؤ شدہ مونچھیں یاد آ جاتی ہیں، جن پر پہلے گیارہ بج کر پانچ منٹ تھے، پھر سوا نو اور اسی طرح آخر میں ساڑھے چھ بج گئے تھے۔

یونہی

یونہی ضد کی مَیں نے اور بعد میں اپنی حماقت پر ہنسی بھی آئی۔ گرمی کا یہ حال کہ الاماں، سب کے سب پہاڑ پر جارہے ہیں اور میں ہوں کہ ٹھہرنے کے لیے مچل رہا ہوں۔ اس لیے کہ پاگل خانے میں ہماری چند کلاسیں باقی تھیں۔ ہمیں دماغی بیماریوں پر لیکچر دیئے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں پاگل خانہ دکھائیں گے۔ پاگلوں کو دیکھنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ سارا سارا دن یہی سوچتا رہتا کہ پاگل کیسے ہوتے ہوں گے؟

ویسے کلاسیں پہلے ہی ہو جاتیں، لیکن کسی نہ کسی بہانے ملتوی ہوتی رہیں۔ حتیٰ کہ بُری طرح گرمی پڑنے لگی۔ سب پہاڑ پر جانے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن میں اڑا رہا کہ کلاسوں کے بعد آؤں گا۔ خوب مذاق اڑایا گیا کہ پاگلوں کو دیکھنے کے لیے ٹھہر رہا ہے، خدا خیر کرے۔

جب انہوں نے دیکھا کہ یہ نہیں مانتا تو اجازت دے دی اور چلتے ہوئے ہدایت کی۔ ”کلاسوں کے بعد فوراً ہی آ جانا۔ تمہاری حرکتوں سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تمہیں وہاں کی آب وہوا پسند نہ آ جائے!“

وہ سب چلے گئے۔ ادھر انتظار شروع ہو گیا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن طلوع ہوا جس کی مدّت سے راہ تک رہا تھا۔ ہم سب پاگل خانے پہنچے، وہاں ہمیں ”آدابِ پاگل خانہ“ پر مختصر سا لیکچر دیا گیا اور اس کے بعد پاگل دکھائے گئے۔ ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بَل پڑ گئے۔

پاگل کیسے عجیب ہوتے ہیں۔ ابھی چیخیں مار مار کر رو رہے تھے، ابھی کھِلکھِلا کر ہنس دیں گے۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو جائیں گے۔ کوئی شعر پڑھ رہا ہے۔ کوئی پکّے راگ گا رہا ہے۔ تقریباً سارے پاگل پکّے راگ گاتے تھے کیونکہ ہماری سمجھ میں ایک گانا بھی نہ آیا۔ اس روز ہماری کلاس بہت جلد ختم ہو گئی۔ راستے بھر ہم خدا کا شکر ادا کرتے آئے جس نے ہمیں ذی ہوش بنایا۔ اگر خدانخواستہ پاگل ہوتے تو کیا ہوتا؟ رونگٹے کھڑے ہوتے تھے اس خیال پر۔

اگلے روز پھر وہیں گئے۔ ایک صاحب بڑی مسمّی صورت بنائے ہوئے آئے اور چپکے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے تو ان کی بڑی تعریفیں کیں پھر پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اسی لہجے میں کہا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب ہنسے اور بولے۔ "تم گھر جاؤ گے؟"

انہوں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ "اور تم گھر جاؤ گے؟"

لڑکے ہنسنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب ذرا سنجیدہ ہو کر بولے۔ "بیوقوف سوالوں کا جواب دو۔"

انہوں نے بھی اسی انداز سے کہا۔ "بیوقوف سوالوں کا جواب دو۔"

لڑکے قہقہے لگانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب خفا ہو کر بولے۔ "جواب بھی دو، گدھے کہیں کے۔"

انہوں نے ذرا سوچا پھر بڑی آہستگی سے کہا۔ "جواب بھی دو، گدھے کہیں کے۔"

ڈاکٹر صاحب چیخ کر بولے۔ ”شَٹ اپ!“

انہوں نے چنگھاڑ کر کہا۔ ”شَٹ اپ!“

ایک صاحب ایک درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ چونکہ بقیہ پاگل شور مچا رہے تھے، اس لیے ہم ان کے پاس چلے گئے۔

”آداب عرض!“ انہوں نے ہماری طرف دیکھ کر کہا۔

”آداب عرض!“ ہم بولے۔

”بھلا دیکھئے تو سہی۔ کہیں مَیں پاگل ہوں؟ ان کم بختوں نے زبردستی مجھے پاگل بنا رکھا ہے۔ مجھے بھی تو پتہ چلے، آخر کیا بات ہے مجھ میں پاگلوں کی سی۔ آپ مجھ سے سوال پوچھیئے، مَیں جواب دوں گا۔“

سوال پوچھے گئے۔ انہوں نے صحیح جواب دیئے۔

پھر ہم نے پوچھا۔ ”تمہاری عمر کیا ہو گی؟“

بولے۔ ”اَب تو پتہ نہیں۔ ویسے میرا ایک چھوٹا بھائی ہے جو دو سال گزرے مجھ سے دو سال چھوٹا تھا اب وہ نالائق مجھ جتنا ہو گیا ہے اور اگلے سال مجھ سے ایک سال بڑا ہو جائے گا۔“

”تو کیا ان دِنوں تم نہیں بڑھ رہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”اجی اب میں کیا بڑھوں گا۔ جتنا بڑھنا تھا بڑھ چکا۔“ وہ بولے۔ ”آپ یہاں آئے کس طرح؟“ ہم میں سے کوئی بولا۔

”کیا بتاؤں صاحب! ایک ہی دن میں ہمارے ہاں بے شمار انتقال ہو گئے۔ ایک سوتیلی بھتیجی، ایک خلیا ساس، ایک دور دراز کے رشتے کی نانی جان، سب منتقل ہو گئیں۔ سُنتے ہیں کہ اس روز میں نے کچھ اُلٹی سیدھی حرکتیں کیں اور یہ مجھے پکڑ لائے۔ ان باتوں کو کئی سال گزر چکے۔ انہیں بار بار یقین دلاتا ہوں کہ میں پاگل نہیں، لیکن کوئی سُنتا بھی ہو، خدا کے لیے آپ ہی انہیں سمجھائیے۔“

ہمیں اس غریب پر ترس آ رہا تھا اور پاگل خانے والوں پر غصّہ۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ مہتمم صاحب سے مل کر اس کی سفارش کریں گے۔

”کچھ نہ کچھ تو خلل ضرور ہو گا آپ کے دماغ میں ایک طرف سے آواز آئی۔“

"بالکل نہیں۔ میں اچھا بھلا صحیح الدّماغ شخص ہوں۔ البتہ ایک ذرا سا نقص ہے؟"

"وہ کیا؟" ہم سب بولے۔

"وہ یہ کہ بعض اوقات میں کچھ کچھ مُرغ بن جاتا ہوں۔"

"مرغ بن جاتے ہو! کیا مطلب؟"

"یہی کہ بیٹھا ہوں۔ اچھی اچھی باتیں کر رہا ہوں۔ پھر ایک دم مُرغ بن جاتا ہوں۔ اب!۔۔۔۔ اب دیکھیئے میں مُرغ بن رہا ہوں۔ ککڑوں۔۔۔۔ کوں۔۔۔۔ ککڑوں۔۔۔۔۔ کوں۔۔۔۔۔۔"

ایک صاحب جو نہایت خوش پوش تھے، بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ ہم نے سوچا یہ ضرور کم پاگل ہوں گے۔

ہمیں دیکھ کر وہ بڑی بے نیازی سے مُسکرائے۔

ایک لڑکے نے پوچھا۔ "کیوں صاحب! آپ پاگل ہیں؟"

وہ بولے۔ "جیسے کہ آپ!"

کوئی بولا۔ ''کیا بات کہی یہ۔۔۔۔ خبطی معلوم ہوتا ہے۔''

وہ بولے۔ ''جیسے کہ آپ۔''

کوئی اور بولا۔ ''دیوانہ ہے!''

انہوں نے فوراً جواب دیا۔ ''جیسے کہ آپ''

ایک صاحب چڑِ کر بولے۔ ''جیسے کہ آپ! جیسے کہ آپ! جیسے کہ آپ کیا ہوا؟''

جواب ملا۔ ''جیسے کہ آپ!''

ایک اور صاحب ملے جو نہایت معقول دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ہمارا استقبال کیا بلکہ ایک شعر بھی پڑھا پھر فرمائش کی کہ کوئی اچھا سا شعر انہیں سنایا جائے۔

ایک لڑکے نے یہ شعر پڑھا۔

ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

کیاتو وہ مُسکرا رہے تھے اور کیا یک لخت غمگین ہو گئے۔ بولے ”یہ شاعری ہے؟ کیا اسے شاعری کہا جاتا ہے؟ افسوس ہے آپ لوگوں کی ذہنیت پر اور ملک کی حالت پر۔ جو شاعری غدرّ کے زمانے میں تھی، وہی اب تک چلی آتی ہے۔ توبہ توبہ ہم لوگ بھی کتنے قدامت پسند ہیں؟ آج کل نئے نئے ہتھیار آ گئے ہیں، لیکن ہمارے ہاں وہی خنجر، نیمچہ اور کٹار استعمال کرتے ہیں۔ نہ کہیں پستول کا ذکر ہے نہ رائفل کا۔ ایک سے ایک اچھا ساز رائج ہے۔۔۔۔۔ وائلن، کلایونٹ، گٹار لیکن ہمارے شعروں سے بانسری اس بُری طرح چمٹی ہے کہ اُسے پنشن ہی نہیں ملتی۔۔۔۔۔!“

ہم اس مدلّل گفتگو پر حیران رہ گئے۔

”تو کیا یہ شعر جو ابھی پڑھا گیا ہے غلط تھا؟“ کسی نے پوچھا۔

”تعجب ہے کہ آپ لوگ اب بھی اسے شعر ہی سمجھ رہے ہیں۔ ذرا پھر پڑھیے۔“

انہوں نے دوبارہ شعر سُنایا۔

وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر بولے ”یہی خیال اگر اس طرح ظاہر کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔۔۔۔

دُھندلی دُھندلی شام کے لمحات میں

کام سے فرصت ہو جب

سائیکل لے کر کرائے کی ترے کوچے کا رُخ

سائیکل بے لیمپ اور ہر دم کرائے کا خیال!

عاشقی کی یہ روایات قدیم

کہ ترے کوچے میں ہر راہگیر سے باتیں کروں

ہر جوان و پیر سے باتیں کروں

اور پھر ٹریفک کے سپاہی کا بھی فکر

جانے کب سیٹی بجا کر آ پڑے

اور پوچھے سائیکل کا لیمپ ہے حضّت کہاں؟

آہ یہ مجبوریاں!

غیر کاروں میں پھریں

اور

ہم عشّاق

سائیکل، وہ بھی کرائے کی ملے

ہائے رے ظالم سماج!

یاد آتا ہے ہمیں

دُھندلی دُھندلی شام کے لمحات میں

جانا کوچے میں ترے۔۔۔۔

دیکھئے کس قدر بہتر چیز ہو گئی!" انہوں نے فاتحہ انداز سے ہمیں دیکھا۔

"تو پھر شاعری بیکار ہے کیا؟؟" ایک نے پوچھا۔

"اجی بیکار کون مسخرہ کہتا ہے؟ شاعری تو بڑی کار آمد چیز ہے۔ شاعری کام آنی چاہیے۔ سرمایہ داری کے خلاف شعر کو مزدوروں کی حمایت میں لکھیں۔ غزلیں لکھو مزدوروں کے رشتہ داروں کے بارے میں، سماج کے متعلق، سماج کے اجارہ داروں کے متعلق۔ غزلوں کے عنوان ہوں۔ مزدور کا بہنوئی، مزدور کی ساس یا

پھر سرمایہ داروں کی رعونت پر بھی دو غزلے سہ غزلے لکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سرمایہ دار کے مٹّی ڈھونے سے انکار پر ایک بہت عمدہ غزل کہی جا سکتی ہے۔ اسی طرح۔۔۔ سرمایہ دار کی اپنی لڑکی اور چوکیدار کے عشق پر خفگی۔۔۔۔ اور 'امیری اور غریبی میں جُوتا چلنا' بھی اچھے موضوع ہیں۔ دیکھئے نا یہ سماج ہی کا قصور ہے آخر سرمایہ دار اپنا سارا روپیہ پبلک میں تقسیم کر کے کاشی یا حج کو کیوں نہیں چلے جاتے؟ اور یہ لوگ بھی پاگل ہی ہیں کیوں نہیں کسی دن سارے امیروں کی کوٹھیوں پر ہل چلا دیتے؟"

"صاحب سماج کے متعلق کیا لکھا جائے؟"

"اجی سماج کا بھانڈا پھوڑ دیا جائے۔ سماج ہمیں کچھ بھی نہیں کرنے دیتا، ہماری زندگی تلخ کر رکھی ہے؟"

"غالباً آپ سماج کے غم میں گھُل گھُل کر یہاں پہنچے ہیں۔" کوئی بولا۔

"اجی میں کیا، سماج نے تو بہتوں کو یہاں پہنچایا ہے اور بہت سے یہاں آئیں گے۔ لیکن یہ سماج کیا چیز ہے؟ کوئی خفیہ جماعت ہے یا کوئی خونخوار جتھّا؟"

”آپ کو یہ بھی نہیں پتا؟۔۔۔۔ سماج جو ہے تو وہ۔۔۔۔بس سمجھ لیجئے کہ سماج ہی ہے۔“

ہم سب خاموش ہو گئے۔ وہ پھر بولے۔

”اجازت ہو تو دو چار شعر نئی شاعری کے سناؤں۔“

”ضرور۔۔۔۔ ضرور!“

”اس میں مصرعوں کے طول و عرض پر کوئی خاص توجّہ نہیں دی جاتی۔ آج کل کا زمانہ ہے مصروفیت کا، بھلا کس کو فرصت ہے کہ سارا دن ایک شعر کا وزن تولنے پر ضائع کرے۔ عرض کیا ہے۔

زیرِ دیوار کھڑے ہیں ترا کیا لیتے ہیں۔۔۔۔۔

ہم کوئی چور ہیں؟“

پھر بولے۔

”ابر ہے سبزہ ہے اور گلزار ہے۔۔۔۔۔۔

کہیں زکام نہ ہو جائے۔“

لڑکوں نے جی کھول کر داد دی۔

پھر فرمایا۔

”جو دیکھی نبض تو بولا یہ ظالم

(بڑے جوش سے) جو دیکھی نبض تو بولا یہ ظالم بھئی یہ تو مرے گا۔۔۔۔“

ہم نے پھر شور مچایا۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے بولے۔ ”چلتے چلتے ایک اور شعر سُن لو۔۔۔۔ عرض کیا ہے۔

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

(ترنم سے) کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کہیں وہ کچھ چُرا نہ لیں۔۔۔۔!“

اس طرح ہم کئی دفعہ وہاں گئے، طرح طرح کے تماشے دیکھے۔ دل کھول کر ہنسے۔ مَیں خوش تھا کہ سارے پُر لطف واقعات سری نگر پہنچ کر سب کو سناؤں گا۔ انہیں بھی تو پتہ چلے کہ میں نے یونہی وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

علی الصبح لاری میں بیٹھا۔ نہ جانے پاگلوں کو دیکھ دیکھ کر کیا وہم ہو گیا تھا کہ ہر ایک کو گھور گھور کر دیکھتا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ کالی عینک لگا رکھی تھی ورنہ ضرور کسی نہ کسی سے جھڑپ ہو جاتی ہے۔

لاری ایک شہر میں رُکی۔ ایک بزرگ نے سر باہر نکالا۔ اُدھر ایک بالکل اسی نمبر اور سائز کے بزرگ آتے دکھائی دیئے۔

"اخّاہ! شیخ صاحب!" یہ چلّا کر بولے۔

"اُفوّہ! میر صاحب!" انہوں نے چیخ کر جواب دیا۔

"ہاہاہاہا۔"

"ہی ہی ہی ہی!"

"سنائیے۔"

"سنائیے۔"

اس تمہید کے بعد اصل باتیں شروع ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ میر صاحب کہیں ہیلتھ آفیسر ہیں۔ وہ ہندوستان کی جہالت پر افسوس کر رہے تھے کہ لوگ بالکل بے بہرہ ہیں اور خاص طور پر کشمیر میں تو خصوصاً۔

"تبھی تو یہاں اتنی وبائیں پھیلتی ہیں۔ پچھلے ہی دنوں یہاں چیچک پھوٹی تھی۔"

شیخ صاحب بولے۔ "جی ہاں! آپ کا بجانا بالکل فرما ہے۔ نہ نہ میرا مطلب ہے آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔"

میر صاحب بولے۔ "اور آپ کو سُن کر تعجب ہو گا کہ ہماری اتنی کوششوں کے باوجود لوگوں نے چیٹک کا ٹیچا یعنی ٹیچک کا ٹیچا، معاف کیجیے چیٹک کا ٹیکہ۔۔۔ ہاں تو بات یہ ہے کہ کسی نے ٹیٹک کا ٹوٹا۔۔۔ اُفّوہ کیا خبطی ہوں میں بھی یعنی کسی نے ٹوٹک کا ٹیچا۔۔۔ (پھر لمبا سانس لے کر بولے) لا حول ولا قوۃ۔۔۔ کسی نے چیچک کا ٹیٹا۔۔۔ (زور سے) آپ میرا مطلب سمجھتے ہیں نا۔۔۔ یعنی ٹیچک کا۔۔۔"

"چیچک کا ٹیکا" شیخ صاحب چپکے سے بولے۔

''جی ہاں، بس وہی'' میر صاحب کی جان میں جان آئی۔ ''جی تو وہ لوگوں نے نہیں کرایا۔''

اس کے بعد کئی مرتبہ چیچک کے ٹیکے کا ذکر ہوا لیکن میر صاحب کچھ ایسے سہم گئے کہ انہوں نے عمداً اس خوفناک لفظ سے پرہیز کیا۔

ایک صاحب اپنے سامنے چھوٹا سا نقشہ کھولے بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ لاہور میں مکان بنائیں گے اور اپنے بھائی صاحب سے مشورہ لینے جموں جارہے ہیں۔ وہ ایک دبلی پتلی سی نوٹ بُک بار بار پڑھتے اور پھر نقشہ دیکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھا۔ عجب فضول سا نقشہ تھا۔ ایک پیلے کاغذ پر بے ڈھنگے خطوط تھے۔ ایک کونے میں کچھ نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کچھ لائنیں پنسل کی تھیں اور کچھ رنگین روشنائی کی۔ کاغذ پر چکنائی اور ہلدی کے دھبّے بھی تھے۔ شاید شوربا گر چکا تھا۔

وہ لگاتار اسی نقشے کی تلاوت میں مصروف رہے۔

جموں میں ان کے بھائی منتظر ملے، چونکہ ان کا نوکر ابھی نہیں آیا تھا اس لیے لاری کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔

ان کے بھائی بولے۔۔۔۔ "ہاں ہاں! بھئی پڑھے ہیں تمہارے خط، پڑھے کیا ہیں سونگھے ہیں۔ تمہارا لکھا تو کوئی کوئی پڑھ سکتا ہے۔ خاک سمجھ میں نہیں آیا کہ تم نے کون سی جگہ چُنی ہے۔"

"تو پھر نوٹ بُک سے پڑھ کر سُنا دوں؟"

ان کے بھائی نے سر ہلا دیا۔

انہوں نے نوٹ بُک نکالی اور پڑھنا شروع کر دیا۔ "حلوائیوں کے محلّے سے جو سڑک نائیوں کے کوچے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے چوک سے بائیں طرف مُڑ کر قطب الدّین کباڑیے کی دُکان سے جو سڑک نکلتی ہے، اس کے چوک سے بائیں طرف مُڑ کر ایجاد علی پنساری کی دکان کی طرف چلنا شروع کر دیں اور اس کے چوک سے بائیں طرف مُڑ کر۔۔۔۔ معاف کیجئے آپ قطب الدّین کباڑیے کو تو جانتے ہیں نا؟"

"ہاں جانتا ہوں۔"

''اُفّوہ! یاد آیا، اسی کے ہاں سے تو آپ پرانے پرچے خریدا کرتے تھے، جی ہاں تو پھر اس چوک سے بائیں طرف مُڑ کر!''

''کون سے چوک سے؟''

''اجی اسی چوک سے جو قطب الدّین کباڑیے کی دکان کی بائیں طرف مُڑ کر، جو کہ ہے ایجاد علی پنساری کی دکان سے بائیں طرف مُڑ کر، جو کہ ہے؟''

''مَیں سمجھ گیا۔۔۔ تو آخر وہ جگہ ہے کہاں؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔۔۔ تو وہاں سے ایک پتلی سی گلی نکلتی ہے جو ہو گی کوئی ڈیڑھ سو گز لمبی اور سوا گز چوڑی۔ اس میں آپ چلتے جایئے۔ آخر ایک ایسی جگہ آئے گی جہاں گلی بند ہو جائے گی اور آگے کوئی راستہ نہ نکلے گا۔ فوراً بائیں ہاتھ کی حویلی میں بغیر دروازہ کھٹکھٹائے داخل ہو جایئے۔ دراصل وہ دروازہ ہی دروازہ ہے۔ وہاں حویلی ویلی کچھ نہیں ہے۔ وہاں سے آپ کو ایک راستہ ملے گا جو ایک نالے کے ساتھ ساتھ چلے گا۔۔۔ پھر اندر۔۔۔۔!''

''باقی زبانی بتادو۔''

”اچھا!“ انہوں نے نوٹ بُک بند کر لی۔ ”تو عین اس نالے پر وہ جگہ ہے، پڑوس میں ایک گلاب کا باغیچہ ہے۔ آخر کچھ نہ کچھ خوشبو تو وہاں ضرور آیا کرے گی۔“

”چچ چچ۔۔۔۔۔ چچ۔۔۔۔!“ ان کے بھائی صاحب بولے۔ ”سچ پوچھو تو مجھے یہ جگہ پسند نہیں۔ اوّل تو وہاں پہنچنا مشکل ہے اور اگر پہنچ گئے تو نکلنا مشکل ہے اور کوئی جگہ نہیں کیا؟“

”اجی ہے تو، مگر وہ قوّالوں کے محلّے میں ہے۔ چوبیس گھنٹے وہ چیخم دھاڑ رہتی ہے کہ بس خُدا کی پناہ!“

”واہ واہ!“ ان کے بھائی خوشی سے چہک کر بولے۔ ”کیا بات ہے! قوّالوں کا محلہ ہے سچ مچ! بڑا لطف رہے گا۔ کمال ہے وہ جگہ؟“

”آپ موچی دروازے سے چلیے اور ذرا سی دور جا کر بائیں طرف مُڑ جایئے۔ پھر ذرا دور جا کر دائیں طرف، وہاں سے ایک چوڑی سی گلی میں چلے جایئے، پھر کافی دور جا کر دائیں طرف مُڑ جایئے۔۔۔۔ پھر بائیں طرف۔۔۔۔۔!“

”میرا خیال ہے کہ میں وہاں کبھی گیا ہوں۔“ ان کے بھائی بولے۔

"آپ کبھی نہ گئے ہوں، مگر آپ کے عزیز دوست قلندر حسین تو وہیں رہتے ہیں۔ اور ان کے وہ دوست حضرت ہوشیار پوری اور لالہ امرت امر تسری بھی وہیں رہتے ہیں۔"

"قلندر حسین وہاں رہتے ہیں؟ ایمان کی قسم؟" وہ چیخ کر بولے۔

"جی یہ قلندر حسین خوب آدمی ہیں۔ اُس دن میں ایک صاحب کے ساتھ وہاں گیا۔ وہاں جہاں ان کے وہ جو دوست رہتے ہیں جن کی داڑھی نہیں ہے۔۔۔۔ (ہاتھ سے بتا کر) جب میں وہاں پہنچا تو یہ جا چکے تھے، اپنے اُن دوست کے ہاں، جن کی مونچھیں یوں ہیں۔ یہ وہاں بھی نہیں ملے۔ خیر! تو ہم دوسرے روز پھر وہیں گئے، وہ پھر نہیں ملے۔ اس دفعہ ان کے گھر سے کوئی نکلا اور بولا کہ آپ کے آنے سے ذرا دیر پہلے وہ وہاں چلے جاتے ہیں۔ اب ہم وہاں جانے لگے۔ (ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر کے) وہاں۔۔۔۔ جہاں وہ جایا کرتے تھے۔ وہاں جا کر ہمیشہ پتہ چلا کہ وہ تو (دوسری طرف بازو اٹھا کر) وہاں چلے جاتے ہیں۔ خیر! اس روز ہم ان کے ساتھ وہاں بھی گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ وہاں وہ تھے ہی نہیں!"

"خوب خوب، تو گویا وہ وہاں کبھی نہیں گئے؟"

"اجی وہاں تو گئے تھے لیکن (زور لگا کر) وہاں کبھی نہیں گئے، جہاں ہمیں لوگوں نے تب بتایا تھا جب ہم وہاں گئے تھے۔"

"لاحول ولا۔۔۔ تو تم (اشارہ کر کے) وہاں کیوں نہیں گئے جہاں وہ اس دفعہ گئے تھے۔"

"اجی یہی تو رو رہا ہوں کہ وہ وہاں ملے ہی نہیں، جہاں ہم اس مرتبہ گئے۔ دراصل وہ جاتے ضرور تھے، وہاں بھی۔۔۔ اور وہاں بھی۔۔۔ لیکن (زور لگا کر) وہاں کبھی کبھار جاتے تھے!"

"تو پھر وہ کبھی ملے آپ کو؟" ایک بیزار سے شخص نے پوچھا جو اس گفتگو کو بڑے انہماک سے سُن رہا تھا۔

دونوں بھائی ناراض ہو گئے اور بڑی قہر بھری نگاہوں سے اس بدنصیب انسان کو دیکھا۔ ان کا نوکر بھی آ گیا تھا جو سامان اٹھا رہا تھا۔

"اچھا تو اب گھر چلیں۔"

"جی ہاں چلیے۔" انہوں نے کہا۔ "تو میں کہہ رہا تھا کہ قلندر حسین صاحب پھر کہیں اور جانے لگے، لیکن نہ تو وہاں (اشارہ کر کے) اور نہ (زور لگا کر)

وہاں۔۔۔۔ بلکہ (ایک اور طرف اشارہ کرکے) وہاں۔۔۔۔۔ جہاں وہ کبھی نہیں گئے تھے اور پھر۔۔۔۔۔۔"

ان کی آوازیں دھیمی ہوتی گئیں۔ وہ کافی دور جا چکے تھے۔ اُن کی گفتگو سنائی نہیں دے رہی تھی، البتہ ہاتھوں کا مٹکانا اور سَروں کا گھمانا اس بات کا شاہد تھا کہ ابھی تک قلندر حسین صاحب مدظلّہ ہی کے متعلق بحث ہو رہی ہے کہ وہ کہاں تشریف لے جایا کرتے تھے۔۔۔۔۔ وہاں۔۔۔۔۔ یا (زور لگا کر) وہاں۔

سامنے کی سیٹ پر دو دُبلے پتلے کھدر پوش اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لمبے تڑنگے شکاری سے کہہ رہے تھے۔ "میں انقلاب چاہتا ہوں۔ ایک ایسا انقلاب جسے میں نے خوابوں میں دیکھا ہے۔ جس کی تمنّا میرے دل میں مچلتی رہی ہے، میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش۔۔۔۔۔ ایک انقلاب!"

شکاری صاحب بولے۔ "کس قسم کا؟ اور کس نمبر کا؟؟" غالباً وہ سمجھے کہ کسی کارتوس کا ذکر ہو رہا ہے۔

برابر بیٹھے ہوئے مولانا بولے۔ "لاحول ولا قوۃ!"

کھدر پوش صاحب نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور انگلی نچا کر بولے۔ ”جب وہ انقلاب آئے گا تو ہم سماج کی تکّا بوٹی کر دیں گے۔ آہ! اس ظالم دہشت ناک درندے نے ہماری نسلوں کو تباہ کر ڈالا ہے۔“

”کون سے جنگل کی بات ہے؟“ شکاری صاحب نے پوچھا۔

مولانا بولے۔ ”اجی لاحول ولا، آپ تو شکاری معلوم ہوتے ہیں۔“

کھدر پوش کہہ رہے تھے۔ ”ہم میں سپاہی بننے کی صلاحیت اب تک موجود ہے۔ ہم تلواروں سے کھیل سکتے ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہماری رگوں میں جنگجو قوموں کا لہو زور مار رہا ہے اور۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔ (شکاری سے) صاحب آپ کے پاس پنسل تراش ہو گا کیا؟ یہ پنسل ٹوٹ گئی ہے ذرا۔۔۔۔۔!“

شکاری صاحب نے پہلے تو اپنے تیس چالیس جیبوں والے کوٹ کو جھنجھوڑا۔ پھر کسی جیب سے ایک ڈیڑھ ہاتھ لمبا چاقو نکالا اور کھول کر صاف کرنے لگے۔ کھدر پوش کی جیسے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ سہم کر بولے۔ ”اجی اسے وہیں رہنے دیجئے، خطرناک ہتھیاروں سے یوں نہیں کھیلا کرتے۔ یقیناً مجھے پنسل

کی کوئی ضرورت نہیں، خدا کے لیے اسے بند کر لیجئے۔ میرے پاس پارکر کا قلم موجود ہے۔ شکریہ!"

مولانا ہنستے ہوئے بولے۔ "لا حول ولا قوۃ۔۔۔۔۔ آپ ضرور شکاری ہیں۔"

"جی ہاں، میں شکاری ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

"جی نہیں، بھلا مجھے لا حول ولا۔۔۔۔ کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بھی خوب رہی، لا حول ولا۔۔۔۔ آپ اکیلے ہی ہیں کیا؟"

"جی ہاں، اکیلا ہوں۔ بندوقیں اور کتّے پہلے پہنچ چکے ہیں۔ تین لاجواب بندوقیں ہیں اور گیارہ کتّے۔ جن میں سے چار تو خاصے بڑے ہیں، اتنے اتنے جتنا آپ کا یہ لڑکا۔۔۔۔ اور باقی یہی کوئی تیس چالیس سیر کے ہیں۔"

اس مرتبہ مولانا باقرأت بولے "لا حول۔۔۔۔ ولا۔۔۔۔۔ قوۃ۔۔۔۔۔۔ الا۔۔۔۔۔ بلّا۔"

"کیوں صاحب! آپ ہم سے بدظن ہیں کیا؟" شکاری نے پوچھا۔

"لا حول۔۔۔۔۔ کون کافر بدظن ہے؟"

"تو آپ ہمیں یہاں سے بھگانا چاہتے ہیں؟ یا آپ کو ہم پر شبہ ہے؟"

"میں سمجھا نہیں، لاحول ولا۔۔۔۔۔!"

"یہ کیا آپ بار بار لاحول پڑھ رہے ہیں؟"

"لا حول ولا قوۃ۔۔۔۔۔(وہ شرما گئے)۔۔۔۔ کوئی جان بوجھ کر تھوڑا ہی کہتا ہوں۔ یونہی مُنہ سے نکل جاتا ہے۔ بس لا حول۔۔۔۔۔" (بڑے ضبط سے انہوں نے بقیہ حصّہ روکا) پھر وہ یک لخت چپ ہو گئے۔

ایک جگہ وہ اُترنے لگے۔ لاری ٹھہرتے ہی کچھ دیر اِدھر اُدھر جھانکتے رہے، پھر یکا یک چیخ کر بولے۔ "اماں عبد القدوس صاحب، لاحول ولا قوۃ۔"

جن صاحب کو مخاطب کیا گیا تھا انہوں نے بھی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "ارے لاحول ولا قوۃ۔ کہاں ہو بھی؟"

"لاحول۔۔۔۔ ادھر دیکھو بھی۔ اماں عبد القدوس صاحب لاحول ولا قوۃ۔"

ان کا سامان اتار دیا گیا اور لاری چلنے لگی۔ شکاری نے اپنے آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات کے کان میں کچھ کہا اور پھر بلند آواز سے بولے۔ "نعرۂ لاحول۔"

وہ سب چلّا کر بولے۔ ”لا حول ولا قوۃ۔۔۔۔ الّا۔۔۔ باللّٰہ۔“

مولانا کھسیانے ہو گئے۔ ان کے ہونٹ ہلے۔ انہوں نے کچھ کہا۔ ہم سُن تو نہ سکے۔ غالباً لا حول ہی پڑھی ہو گی۔

لاری میں رونق کم ہو گئی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پیچھے کی سیٹ پر ایک جوڑا بیٹھا تھا۔ ایک حسین لڑکی اور ایک بد تمیز سا لڑکا۔ بد تمیزیوں کہ اس کی حرکات بالکل فضول سی تھیں۔ دونوں نئے نئے شادی شدہ معلوم ہوتے تھے۔

لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”ذرا نیچے دیکھئے تو سہی۔ نالے کا پانی کی طرح جھاگ اُڑا رہا ہے۔ پتھروں سے سر دے دے کر کے مارتا ہے جیسے کسی کا ماتم کر رہا ہو۔ بھلا اسے کیا غم ہے؟“

لڑکا چونک پڑا۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا۔ پہلے دو تین چھینکیں ماریں پھر بولا۔

”کیا کہا تم نے؟“

”ذرا نالے کا پانی تو دیکھئے کتنا اچھال لگ رہا ہے؟“

"اچھا لگتا ہو گا تمہیں۔ مارے شور کے میرے تو کان پھٹے جا رہے ہیں۔"

لاری چڑھائی پر جا رہی تھی۔ "وہ دیکھئے اس ننھی سی سڑک سے ہم آئے تھے۔ وہ پہاڑ بالکل یوں نظر آ رہے ہیں جیسے ریت کی چھوٹی چھوٹی لہریں ہوں۔ ہم نہ جانے کتنی بلندی پر ہیں۔"

لڑکے نے دو تین اور چھینکیں ماریں اور بولا۔ "اور جو یہاں سے گر پڑیں تو ہڈّی پسلی ایک ہو جائے۔"

لڑکی چُپ ہو گئی۔ دیر تک ان میں سے کوئی نہ بولا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر رنگ برنگے بادلوں کے عجیب نمونے بنے ہوئے تھے۔

دفعتہً لڑکی مسرت سے مغلوب ہو کر بولی۔ "یہ دیکھئے کیسے رنگ رنگ کے بادل ہیں، اور وہ درختوں کی قطار اونچے پہاڑوں پر یوں لگتی ہے جیسے سنہری سنجاف ہو اور یہ ننھے ننھے پرندے اُڑتے ہوں۔۔۔۔۔"

"سُن لیا! سُن لیا! تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ روز سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ کسی نے سورج ڈوبتے نہ دیکھا ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ اونہہ! شفق کی بہار۔۔۔۔ بادلوں کی سنجاف۔۔۔۔ خاک۔۔۔۔ دھول۔۔۔۔!"

پھر اپنی ناک سے کھیلنے لگا۔ شاید اسے زکام تھا۔

لڑکی کچھ دیر چپ رہی۔ اب کد آنے والا تھا۔ لاری ایک جگہ مُڑی اور چاند سامنے آ گیا جو ابھی ابھی نکلا تھا۔ لڑکی نہ رہ سکی۔ ”کتنا چمکدار چاند ہے؟ ایسا چاند بھی شہروں میں بھی دیکھا؟ یوں لگتا ہے جیسے۔۔۔۔ جیسے۔۔۔۔۔!“

”کیا مصیبت ہے۔۔۔۔ تنگ کر دیا تم نے۔۔۔۔ جی چاہتا ہے لاری سے چھلانگ لگا دوں۔ آخر کیا دھرا ہے اس چاند میں؟“

لڑکی مُنہ بسور کر بولی۔ ”تو آپ کو قدرتی نظارے اچھے نہیں لگتے؟“

”کوئی خاص نظارہ ہو تو پسند بھی کروں، مگر تمہارے لیے تو ہر چیز قدرتی نظارہ ہے۔ گائے چر رہی ہو، کتّا بھونک رہا ہو، بکری جگالی کر رہی ہے، کچھ بھی ہو رہا ہو۔“

”لیکن شادی سے پہلے تو آپ ہمیشہ میری باتوں کو پسند کیا کرتے تھے، اور وکالت پڑھتے ہوئے بھی آرٹ کو پسند کرتے تھے۔“

”تب اور بات تھی۔ اب تو شادی ہو گئی ہے اور وکیل بھی بن چکا ہوں۔“

رات بھر کد میں قیام رہا۔ میرے دماغ میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ لاری کے مسافر کچھ پاگل سے دکھائی دیتے تھے جس کسی کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھنے لگو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگتا تھا، لیکن وہ پُر جلال چہرے والے مولانا تو ضرور عقلمند ہوں گے۔ کچھ بھی ہو وہ کبھی ایسی باتیں نہیں کر سکتے اور وہ سردار صاحب بھی ذی ہوش معلوم ہوتے ہیں۔

صبح صبح سفر شروع ہوا۔ راستے میں جگہ جگہ بید مجنوں کے درخت کھڑے تھے۔ ایک صاحب نے جو بڑے غور سے ہر ایک درخت کو دیکھ رہے تھے بلکہ شاید گِن رہے تھے، پلٹ کر پوچھا۔ ''کیوں جناب! یہ درخت کون سا ہے؟''

''بید مجنوں!'' میں نے کہا۔

''بے۔۔۔ دے۔۔۔۔ مج۔۔۔ نوں!'' انہوں نے الفاظ کو چباتے ہوئے فرمایا۔

''کیا مطلب ہوا اس کا؟ یعنی مجنوں کی چھڑی؟''

ساتھ والے حضرت ہنس کر بولے۔ ''جی نہیں یونہی نام ہے۔ اس درخت کی ٹہنیاں یوں جھکی رہتی ہیں جیسے مجنوں کے بال پریشان رہا کرتے تھے۔''

برابر والے پنڈت جی بولے۔ ”غلط ہے صاحب! اس درخت کو دور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی رو رہا ہو۔“

اب خاں صاحب کہاں رہ سکتے تھے۔ بولے۔ ”جناب یہ بات نہیں، بلکہ مجنوں اس درخت کو پکڑ کر رویا کرتا تھا۔“

اس پر وہی صاحب جو نام پوچھ رہے تھے۔ کچھ دیر سوچ کر بڑی سنجیدگی سے بولے۔ ”تو جناب! مجنوں کشمیر میں گزرا ہے کیا؟“

سب کے سب ہنس دیئے۔ خاص طور پر میرے داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے سردار صاحب تو بڑے زور سے ہنسے اور کافی دیر تک ہنستے رہے۔ جب لاری میں سکون ہو گیا تو چپکے سے میرے کان میں بولے۔ ”بات کیا تھی؟“

اب ہمارا سفر ختم ہو رہا تھا۔ سری نگر نظر آنے لگا۔ مولانا کا چھوٹا سا بچّہ خوش کر بولا۔

”ابّا جان! وہ دیکھیے سری نگر آ گیا۔“

مولانا پر مرگی کی قسم کا دورہ پڑا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے، آنکھیں بند کر لیں، ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت کی مونچھیں ایک بالشت اُوپر چڑھ گئیں۔ کچھ دیر تو اسی طرح مراقبے میں رہے پھر چیخ کر بولے۔ ”نامعقول بچّے! یہ تو نے کیا کیا؟ سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ تو ہمارے خاندان کا نام ڈبو کر چھوڑے گا۔ داڑھی سفید ہو گئی (بالکل سیاہ تھی) تجھے پڑھاتے پڑھاتے کس قدر غلط اُردُو بولتا ہے تو۔۔۔۔ (مُنہ چڑا کر) سری نگر آ گیا۔ بد نصیب بچّے! سری نگر کوئی آدمی ہے، پرندہ ہے یا چوپایہ؟ یا اس کے نیچے پہیے لگے ہیں جو آ گیا۔ اس کی جگہ پھُوٹے مُنہ سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ہم سری نگر پہنچ گئے کیونکہ جو چیز مشترک ہے وہ تو ہم ہیں اور ساکن ہے سری نگر۔ پس متحرک چیز ساکن کی طرف جا رہی ہے، نہ کہ ساکن متحرک کی طرف۔“

چار پانچ سال کا بے چارہ بچّہ ڈر گیا۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ غریب نے سوچا شاید دیکھنے میں غلطی ہو گئی ہے۔ پھر کھڑکی سے جھانکنے لگا اور سہم کر بولا۔ ”ابّا جان سری نگر ہی تو آ رہا ہے۔“

مولانا نے ایک لمبا سانس لیا اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلّائے۔

"بس بس خاموش او ناہنجار بچّے! غلطی پر غلطی کیے جا رہا ہے۔ ایک لفظ اور نکالا تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

اور میں سوچنے لگا۔ کیا ہم سب پاگل ہیں؟ اگر مکمل طور پر نہیں تو تھوڑے بہت ہی جن لوگوں کو ہم سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں، اگر ان کی ایک ایک حرکت کا بغور مطالعہ کریں تو کیا ہو؟

جن باتوں پر ہم یونہی ہنس دیتے ہیں یا جن پر دیدہ دانستہ توجہ نہیں کرتے انہیں ذرا اچھی طرح سے سوچیں تو کیسے مضحکہ خیز نتائج نکلیں؟

مجھے پاگلوں کے لطیفے بھولتے جا رہے تھے کیونکہ ان سے کہیں عجیب و غریب تماشے میں عقلمندوں میں بیٹھ کر دیکھ چکا تھا۔

سری نگر میں جب سب نے پاگلوں کے متعلق پوچھا تو نہ جانے کیوں مجھ سے وہ پر لطف کہانیاں نہ سنائی گئیں۔ میں یونہی ٹال مٹول کر گیا۔

مشورے

(ریڈیو کا ایک فیچر)

اناؤنسر۔۔۔"خواتین و حضرات! اس مہینے ہمیں طرح طرح کے مشورے موصول ہوئے۔ پہلے تو ہم ہچکچائے، لیکن چونکہ جدّت کو ہر جگہ پسند کیا جاتا ہے اس لیے انہیں پیش کرتے وقت ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہے۔ خود ہی سوچیے، جہاں ایک کرکٹ کا میچ نشر ہو سکتا ہے اور مشاعرے نشر کیے جاسکتے ہیں وہاں ایک لڑائی کیوں نہیں پیش کی جاسکتی؟ ایک قدرتی نظارے کو کیوں نہیں بیان کیا جاسکتا؟

جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے بھیجے ہیں، ہم ان کے احسان مند ہیں۔ انہوں نے ہماری توجہ روزمرہ کی Routine چیزوں سے ہٹا کر ایک ترقّی پسند راستے کی جانب مبذول کرائی ہے اور ترقی پسند باتوں پر تو لوگ جان چھڑکتے ہیں۔

آج ہم اس فیچر میں تین مشورے پیش کر رہے ہیں، جو یکے بعد دیگرے نشر کیے جائیں گئے۔بقیہ مشورے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔"

ا۔جنگ

سب سے پہلے ہم ایک سچ مچ کی جنگ نشر کرتے ہیں۔

یہ جنگ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان ہوئی ہو گی۔ کہاں؟ مغربی گھاٹ کے کسی ناہموار میدان میں، یا شاید مشرقی گھاٹ کے آس پاس۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ یہ کہیں وسطی سطح مرتفع پر ہی نہ ہوئی ہو۔

دونوں فوجیں لڑائی پر کیوں آمادہ ہیں؟۔۔ اس کی وجہ "بابر میموریل شیلڈ" بتائی جاتی ہے۔

سامعین !اس سے پہلے اس شیلڈ کے لیے مرہٹوں نے لاکھ کوشش کی،اچھی سے اچھی ٹیم بھیجی۔ ہمارا مطلب فوج سے ہے، لیکن ہمیشہ مغل ہی جیتتے رہے، کیونکہ ان کی صحت کہیں بہتر تھی۔اس مرتبہ دیکھیے کیا ہوتا ہے؟ہم چند انگریزی الفاظ استعمال کریں گے۔ آپ چنداں خیال نہ فرمائیں یہ ہم مجبور ہو کر کر رہے ہیں۔ ہاں تو اس سالانہ ٹورنامنٹ کی چوتھی جنگ پیش کی جارہی ہے۔

اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں۔ ہم ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہیں۔ سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے سب کو سبکیاں آرہی ہیں۔ سورج ابھی ابھی نکلا ہے۔ امید ہے دوپہر کو خاصی گرمی ہو جائے گی۔ میدانِ جنگ کی گھاس چند روز ہوئے کاٹی گئی تھی، لیکن میدان پر اوس بہت پڑی ہوئی ہے۔ کہیں لوگوں کے اور گھوڑوں کے پاؤں نہ پھسلنے لگیں۔ سفید لائنیں لگائی جارہی ہیں۔ ہمارے سامنے ایک بہت بڑے خیمے کے نیچے بے شمار سپاہی کھڑے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ہزاروں ہوں گے، ہزاروں نہیں تو لاکھوں ضرور ہوں گے۔ مغل اور مرہٹے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ شروع شروع میں یہ لوگ لڑائی سے پہلے کبھی نہ ملتے تھے، لیکن اب سپورٹس مین بن گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے سفر کے حالات پوچھ رہے ہیں۔ کچھ نعرۂ جنگ لگانے کی مشق کر رہے ہیں اور چند سپاہی پنجے لڑا رہے ہیں۔ پورے آٹھ بجے لڑائی شروع ہو گی۔ صرف پچیس منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

پہلے لڑائی کے فیصلے کے متعلق بڑی گڑبڑ ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو فیصلہ بالکل نہیں ہو سکتا تھا کہ کون جیتا ہے۔ مرہٹے کہتے تھے ہم جیتے ہیں اور مغل کہتے تھے ہم۔ چنانچہ اس سال دو امپائر آئے ہیں۔ ایک امپائر بنگال سے بلایا گیا ہے اور

دوسرا بلوچستان سے۔۔۔ ان دونوں کو اس لڑائی میں کوئی دلچسپی نہیں، اس لیے ہمیں امید ہے کہ فیصلہ غیر جانبدارانہ ہوگا اور بلا حیل و حجّت قبول کیا جائے گا۔

سامعین! پچھلے سال جنگ ختم ہوئی اور جب فیصلہ سنایا گیا تو اس قدر ناپسند کیا گیا کہ لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی اور ہفتوں تک ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ دونوں ٹیموں کا بھر کس نکل گیا۔۔۔ ہمارا مطلب ہے فوجوں کا!

وہ دیکھیے! دونوں امپائر گھوڑوں پر سوار سفید زرّہ بکتر پہنے میدان میں آ رہے ہیں۔ ان کے گھوڑے بڑے تندرست ہیں اور بالکل سفید رنگ کے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک لمبا سا بگل ہے جسے وہ فائل ہونے پر یا لڑائی روکنے کے لیے بجائیں گے۔

وہ انہوں نے اشارہ کیا۔ اب دونوں فوجوں کے کپتان میدان میں آ رہے ہیں۔ مغل کپتان جس کا نام مرزا بعلبک بیگ ہے، ایک لمبا تڑنگا مضبوط All Rounder ہے، جسے دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ ادھر مرہٹوں کا کپتان بالا جی باجی کھڑبڑ دیو مقابلتاً پستہ قد ہے۔ اس کا رنگ کچھ

سیاہی مائل ہے، صحت واجبی سی ہے، مگر سنتے ہیں کہ چستی اور چالاکی میں کسی سے کم نہیں۔

وہ انہوں نے ڈھال ہوا میں اچھالی اور ٹاس کیا۔ ڈھال سیدھی گری۔ مرہٹے ٹاس جیت گئے۔ ان کا کپتان ناچتا کودتا واپس جا رہا ہے۔

اب مرہٹوں کی ساری فوج بائیں طرف اکٹھی ہو رہی ہے۔ مغل دہنی طرف ہیں۔ مغلوں کے سامنے سورج ہے، جس سے ان کی آنکھیں لازمی طور پر چندھیا جائیں گی، لیکن وہ ٹاس جو ہار چکے ہیں۔

ارے! یہ کیا؟۔۔۔۔ ہاں!۔۔۔۔ امپائروں نے دونوں کپتانوں کو پھر بلایا ہے۔ انہیں سمجھا رہے ہیں کہ کہیں کوئی اسی ویسی بات نہ ہو جائے جس سے ناک کٹ جائے یا کان اُڑ جائے۔ لڑتے وقت ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھنا، آدمیت سے لڑنا، کیونکہ انسانیت ہی اصلی چیز ہے۔ سامعین ہمیں ایک شعر یاد آ گیا۔ ہمیں ایسے موقعوں پر اکثر شعر یاد آ جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ

پست ہمّت یہ نہ ہووے، پست قامت ہو تو ہو

اب دونوں کپتان واپس اپنی اپنی فوجوں میں جا رہے ہیں اور ٹیموں کو ترتیب دے

رہے

ہیں۔ مغل کپتان نے اپنی ساری فوج اگلی صفوں میں ٹھونس دی ہے۔ فُل بیک دستہ بالکل معمولی سا ہے اور گول کیپر دستہ تو سِرے سے غائب ہے۔ پیچھے کوئی سپاہی نظر نہیں آتا۔ عجب تماشا ہے! مرہٹے بالکل برعکس کر رہے ہیں۔ اپنا اپنا طریقہ ہے صاحب!

(چوب کی آواز)

وہ لیجئے، ڈھول بج رہے ہیں۔ بگل بجایا گیا۔۔۔ ایک۔۔۔۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تین۔۔۔۔۔ لڑائی شروع ہو گئی!

اس وقت ہماری حالت بھی قابلِ دید ہے، ہمارا دل بری طرح دھڑک رہا ہے۔ آہاہاہا! مغلوں کا سنٹر فارورڈ دستہ تیر کی طرح جا رہا ہے۔ مرہٹوں کے ہاف بیک دستے نے اسے جانے دیا اور اِدھر اُدھر ہو گئے۔ سامعین! اس میں ضرور کوئی چال معلوم ہوتی ہے۔ اب وہ فل بیک دستے تک پہنچ گئے ہیں۔ ارے! یہ کیا؟

وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ فل بیک دستہ بجلی کی طرح تڑپا۔ ہاف بیک دستہ واپس پلٹا اور مغل دستہ وہیں دھر لیا گیا۔

امپائر گھبرائے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ کیوں نہ ہو؟ آج کی جنگ کی لاج ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دیکھئے دو سپاہی باہر نکالے جارہے ہیں۔ کیا بات ہے؟ ٹھہریئے ہم دریافت کر کے بتاتے ہیں۔

(ایک وقفہ)

بات یہ تھی کہ ایک مغل سپاہی نے ایک مرہٹے کو دھکا مار کر گھوڑے سے گرادیا تھا۔ مرہٹے نے مغل کی ٹانگ میں کاٹ کھایا۔ مغل حقارت سے بولا۔ ”اف! اب علاج کے لیے ناحق کسولی جانا پڑے گا۔“

آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ کسولی باؤلے کتّے کے کاٹے کا علاج ہوتا ہے۔ اس سے مرہٹے کے لطیف جذبات کو ٹھیس لگی۔ وہ بولا ”ٹھہر تو سہی، ابھی کہتا ہوں امپائر سے۔“ چنانچہ دونوں کو باہر نکال دیا گیا۔

اچھا ہوا، جب تک ایسی سزائیں نہ دی جائیں، لڑائی میں گڑبڑ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اُفّوہ! دوسرے مغل دستے کا بھی یہی حشر ہوا۔ آخر مغل کوئی اور طریقہ

کیوں نہیں استعمال کرتے؟ مرہٹے چپ چاپ اپنی اپنی پوزیشن پر جمے کھڑے رہتے ہیں۔ مغل تیزی سے آتے ہیں۔ یہ کوئی مدافعت پیش نہیں کرتے اور جب ان کا دستہ گول کیپر دستے تک پہنچتا ہے تو سب مرہٹے ٹوٹ پڑتے ہیں اور انہیں دبوچ لیتے ہیں۔ اس قسم کے داؤ سے تو کبڈی ہی اچھی۔۔۔۔۔۔ واہ واہ۔۔۔۔۔ یوں کب تک ہوتا آخر؟ آب و ہوا کا اثر بھی کوئی چیز ہے۔ غذا اور صحت بھی کوئی معنے رکھتی ہے۔ اتنی سی دیر میں مرہٹے تھک گئے۔ بُری طرح ہانپ رہے ہیں۔ کئی حضرات اپنے خود اور زرّہ بکتر اتار اتار کر امپائروں کو دے رہے ہیں۔

وہ امپائروں نے خیمے کی طرف چلا کر کہا۔ "ذرا پانی بھجوانا۔" چنانچہ چند سقے پانی پلانے جا رہے ہیں۔

اب مغلوں کا پلّہ بھاری ہے۔ مرہٹوں کی خوب خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ مغل انہیں پچھاڑے ڈالتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹے ورزش نہیں کرتے۔ اگر یہی حال رہا تو لڑائی دور تک نہیں چلے گی۔ مغلوں کے پوائنٹس بڑھتے جا رہے ہیں۔

(بگل کی آواز)

اُفّوہ! یہ کیا ہونے لگا؟ بادل آ گئے، آسمان پر اندھیرا چھا گیا، بجلیاں کوند رہی ہیں۔

(بجلی کے کوندنے کی آواز اور بوندوں کا شور)

یہ دیکھئے بُوندا باندی شروع ہو گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ بگل بجائے گئے اور لڑائی بند ہو گئی۔ موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ اب پھر لوگوں کو سسکیاں آ رہی ہیں۔ قدرت مرہٹوں کی مدد کو آ پہنچی، اتنی دیر میں وہ تازہ دم ہو جائیں گے۔

سارے سپاہی بڑے خیمے کے نیچے کھڑے ہیں۔ غالباً بارش دیر تک نہیں رہے گی۔ لیجئے

اتنی دیر تک آپ ایک ریکارڈ سنئے۔۔۔۔۔ شاید یہ میاں کی ملہار ہے۔

(ریکارڈ بجتا ہے۔۔۔۔۔ 'برسن لاگی رے بدریا ساون کی'۔۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد دوسرا ریکارڈ۔۔۔۔۔۔ 'چھا رہی کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے)

(بگل کی آواز)

بارش بند ہو گئی۔ امپائر اور کپتان میدان کا بغور معائنہ کر رہے ہیں۔ یہ لیجئے انہوں نے میدان کو پاس کر کے فوجوں کو بلا لیا۔ پھر لڑائی شروع ہو گئی۔

مرہٹے بڑے جوش و خروش سے لڑ رہے ہیں اور اس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

چند سپاہی لڑتے لڑتے بالکل ہمارے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ڈر ہے کہ کہیں ایک آدھ ہمارے رسید نہ کر دیں۔ آپ ان کی آواز سن سکتے ہیں۔

اوہ مرہٹے کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مغل نے بڑی سپورٹس مین سپرٹ دکھائی اور ایک طرف ہو گیا۔ اب ان کی آواز سنئے۔

مرہٹہ: "ماریے صاحب!"

مغل: "نہتوں پر حملہ کرنا بہادروں کا شیوہ نہیں۔"

چنانچہ مرہٹے نے جھک کر کہا "شکریہ!" اور فوراً ہی نئی تلوار منگوائی، اتنی دیر مغل دوسری طرف مُنہ کیے کھڑا رہا۔ غالباً ضبط کر تا رہا۔ نوکر نئی تلوار لے آیا۔ مرہٹے نے تلوار ہاتھ میں لے کر اِدھر اُدھر ہوا میں وار کیے۔ پھر مغل کو اشارہ کیا اور اس کی ڈھال پر تین چار وار کیے۔ جب اطمینان ہو گیا کہ تلوار مضبوط ہے تو دونوں لڑنے لگے۔ اب وہ لڑتے لڑتے دور نکل گئے۔

(بگل کی آواز)

یہ نفیریاں کیوں بج رہی ہیں؟ کہیں سے ڈھول کی آواز بھی آرہی ہے۔۔۔۔
اخّاہ۔۔۔۔۔ لنچ انٹرول ہو گیا۔ فوجیں کھانا کھانے واپس جارہی ہیں۔ فی الحال ہم بھی اجازت چاہتے ہیں۔ گھنٹہ بھر آپ کو جنگی ریکارڈ سنائے جائیں گے۔

(ریکارڈ بجتا ہے۔۔۔۔۔ 'چل چل رے نوجوان'۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد 'چھائی پچھّم سے گھٹا نونہالو جاگو'۔۔۔۔۔ اور کئی اور ریکارڈ)

لیجئے اب ان انٹرول ختم ہونے کو ہے۔ ہم ابھی ابھی خیموں سے آرہے ہیں۔ مغلوں نے خوب مُرغّن غذائیں کھائی ہیں۔ میٹھے ٹکڑے تو وہ اس قدر کھا گئے ہیں کہ حیرت ہوئی کہ آخر ان لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟ لیکن مرہٹوں نے نہ جانے کس پالیسی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے صرف ذرا ذرا سے چاول پھانک کر صبر کر لیا۔ اب وہ پان کھا رہے ہیں۔ شاید یہ سوچتے ہوں کہ انسان خالی پیٹ اچھا لڑ سکتا ہے لیکن ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ طبّی نقطہ نگاہ سے بھی جب پیٹ خالی ہو تو دم خم کہاں سے آئے گا؟ جسمانی قوّت کا دار و مدار اعلیٰ درجے کی غذا پر ہے اور پھر بزرگوں نے بھی کہا ہے کہ بھوکا بٹیر کیا لڑے گا؟۔۔۔۔ معاف کیجئے ہم خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی ہانک جاتے ہیں۔

اب فوجیں آ رہی ہیں، انہوں نے میدان تبدیل کر لیے ہیں۔ مغل پہلے ہماری دہنی طرف تھے۔ اب بائیں طرف آ گئے ہیں۔ مرہٹے بھی دوسری طرف چلے گئے۔

(بگل کی آواز)

یہ لیجئے لڑائی شروع ہو گئی۔ لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟ مرہٹے بجلی کی طرح تڑپ رہے ہیں اور مغلوں پر چھائے ہوتے ہیں۔ شاید یہ خالی پیٹ کا اثر ہے۔ اُدھر مغل ہیں کہ بالکل سُست پڑ گئے ہیں۔ غالباً پراٹھوں کا خمار چڑھ رہا ہے۔ ابھی ابھی امپائروں نے کئی سوئے ہوئے مغل سپاہیوں کو جگایا ہے۔

یہ مغل کپتان اشارے کسے کر رہا ہے؟ اُفّوہ! ڈھول والوں کو کر رہا ہے۔ تبھی ڈھول زور زور سے بجنے لگے۔

(ڈھولوں کی آواز)

مغل سپاہی چونک پڑے۔ جو اونگھ رہے تھے وہ بھی ہوشیار ہو گئے اور لڑنے لگے۔ مغل کپتان کی اس دانشمندی کی ہم داد دیتے ہیں، اگر وہ ڈھول نہ بجواتا تو غالباً ساری فوج قیلولہ کر رہی ہوتی۔

ارے یہ کیا تماشا ہے؟ بالکل ہمارے قریب ایک نوکر کسی مرہٹہ سپاہی کو بُلا رہا ہے۔ اس نے ٹفن کیریئر پکڑ رکھا ہے اور اس کے اشاروں پر دو سپاہی لڑتے لڑتے ادھر آ گئے ہیں۔ نوکر ہے کہ بدستور بُلا رہا ہے۔ آخر دونوں سپاہی ٹھہر جاتے ہیں۔ آپ ان کا مکالمہ سنئے:

مرہٹہ: ''کیا ہے؟۔۔۔۔۔دیکھتا نہیں ہم مصروف ہیں؟''

نوکر: ''حضور کھانا!''

مرہٹہ: ''بیوقوف! تجھے آدابِ حرب و ضرب کی الف بے بھی معلوم نہیں۔ ہم جب لڑ رہے ہوں تو کسی قسم کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارا وقت ضائع نہ کر۔''

مغل: ''کیا بات ہے بھئی؟''

نوکر: ''میں ان کا کھانا لایا ہوں۔''

مغل: ''کھانا لائے ہو؟۔۔۔۔اب؟۔۔۔۔۔۔تو جناب آپ اب تک بھوکے لڑ رہے تھے؟''

مرہٹہ: ”جی ہاں اس نامعقول نے دیر کر دی۔“

مغل: ”اُفّوہ! آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں نادم ہوں، اپنے کیے پر پشیمان ہوں۔ جایئے کھانا کھایئے۔ میں اتنی دیر انتظار کروں گا۔“

مرہٹہ: ”اجی صاحب آپ بھی ساتھ چلیے۔“

مغل: ”میں چلوں؟۔۔۔۔۔۔ ابھی تو کھانا کھایا تھا۔ خیر! اچھا کیا ساتھ لائے ہو؟“

نوکر: ”حضور! بہت سی چیزیں ہیں، لیکن خاص چیز میٹھے ٹکڑے ہیں؟“

مغل: ”میٹھے ٹکڑے؟۔۔۔۔۔ آہ! کس نے کہا میٹھے ٹکڑے؟ خدایا! یہ میں کیا سُن رہا ہوں! کیا سچ مچ میٹھے ٹکڑے ہیں۔ چلیے جناب! میں ساتھ چلتا ہوں۔“

ان کا مکالمہ ختم۔۔۔۔ اب دونوں نوکر کے ساتھ ساتھ لڑتے ہوئے دور چلے جاتے ہیں۔ سامعین! ہمیں یہاں اختلاف ہے۔ آخری مغل میٹھے ٹکڑوں کو دیکھ کر بے قابو کیوں ہو جاتے ہیں؟ مانا کہ ابھی مزیدار چیز ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ اسی کا وہم ہو جائے۔ ہمیں ایک تجربہ ہو چکا ہے، ایک مغل دوست کی دعوت میں ہم نے میٹھے ٹکڑے کھا لیے اور دیر تک ہمارے پیٹ میں درد ہوتا رہا۔۔۔۔!

اب ہم جنگ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ مغلوں کے پوائنٹس پھر بڑھتے جارہے ہیں۔ غالباً مرہٹے تھک گئے ہیں۔ مغل عجب بے نیازی سے لڑ رہے ہیں۔ غالباً انہیں یقین ہوگیا ہے کہ فتح ان کی ہوگی۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ لڑائی اور امتحان کے نتیجے کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔

(بگل کی آواز)

یہ غُل کیسا مچا؟۔۔۔۔ لڑائی بند ہوگئی۔۔۔ اخّاہ! ٹی انٹرول ہے۔ اب پورے چار بجے ہیں۔ پندرہ منٹ لڑائی بند رہے گی۔ کچھ دیر کے لیے ہم پھر رخصت چاہتے ہیں۔ اتنے میں آپ مرہٹوں اور مغلوں کے فوجی بینڈ سنیے۔

(ایک وقفہ جس میں بینڈ کے ریکارڈ بجتے ہیں)

یہ لیجیئے، اب جنگ کے منعقد ہونے میں صرف تین منٹ باقی رہ گئے ہیں اور میں مائکروفون دوسرے اناؤنسر کو دیتا ہوں۔

دوسرا اناؤنسر: ''شکریہ!۔۔۔''

سامعین! ہم ایک بہت بُری خبر سنانے والے ہیں۔ ہمیں بہت افسوس ہے کہ جہاں مغلوں نے شربت پیا ہے وہاں مرہٹوں نے جی بھر کر تاڑی پی ہے اور

بھنگ بھی پی ہے۔ اب وہ عجیب باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں بھنگ، تاڑی اور چرس وغیرہ سے سخت نفرت ہے!۔۔۔۔ مرہٹوں سے ہرگز امید نہیں تھی۔۔۔۔۔ فوجیں پھر میدان میں آگئیں۔

(بگل کی آواز)

یہ لیجئے لڑائی شروع ہو گئی! لیکن لڑ کون رہا ہے؟ سب کے سب قطعاً بیزار ہیں۔ مغل اخروٹ، پستے اور کشمش پھانک رہے ہیں۔ اُدھر مرہٹوں پر تاڑی کا اثر ہے۔ امپائر بڑے پریشان ہیں۔ بے چارے اِدھر اُدھر منّتیں کرتے پھر رہے ہیں کہ یارو کچھ تو لڑو۔ وہ لیجئے تنگ آکر امپائروں نے دھمکی دے دی کہ اگر لڑائی شروع نہ کی گئی تو دونوں ٹیموں یعنی فوجوں کو Disqualify کر دیا جائے گا۔ طوعاً و کرہاً جنگ آہستہ آہستہ پھر شروع ہو رہی ہے، لیکن سپاہی اس طرح لڑ رہے ہیں جیسے کسی پر احسان کر رہے ہوں۔

اُف! یہ مرہٹے کیا کر رہے ہیں؟ آپس میں ہی لڑ رہے ہیں! چند مرہٹے بالکل ہمارے پاس کھڑے ہیں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی آوازیں غالباً آپ کو صاف سنائی دے رہی ہوں گی۔ سنیے!۔۔۔۔

"ہمیں کیوں مار رہے ہو؟"

"تو اور کسے ماریں؟"

"ان کو مارو!"

"ان کو؟ کن کو؟"

"جن سے لڑنے آئے ہو؟"

"لڑنے کس سے آئے ہیں؟"

"پتہ نہیں، لیکن ہمیں نہ مارو۔"

الغرض ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں ہر طرف ہو رہی ہیں۔ اب بیس منٹ باقی ہیں۔ وہ دیکھیے مرہٹوں کا کپتان آگے بڑھ کر امپائر سے روشنی کی کمی پر اعتراض کرتا ہے کہ اندھیرا سا ہو گیا ہے اور اچھی طرح لڑا نہیں جاتا، دوست دشمن میں تمیز مشکل ہے۔

امپائر آپس میں مشورہ کرتے ہیں، پھر مغلوں کے کپتان سے پوچھتے ہیں، بھلا اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

(ڈھول بجتے ہیں)

ڈھول بجائے جارہے ہیں۔ لڑائی ختم! نتیجے کے لیے لوگ بے قرار ہیں۔ سارے سپاہی میدان میں جمع ہیں۔ ہم خود منتظر ہیں! ہمارا خیال ہے کہ مغل جیتیں گے۔

اے لو! یہ فیصلہ سنا دیا گیا۔ لوگ نعرے لگارہے ہیں۔

(شوروغل)

اس غل غپاڑے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اخّاہ! یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟ برابر رہے! سنا آپ نے؟ دونوں فوجیں برابر ہیں۔ مغلوں اور مرہٹوں کے پوائنٹس بالکل برابر ہیں۔ پہلی مرتبہ اس قسم کا فیصلہ ہوا ہے۔ ویسے بابر میموریل شیلڈ رہے گی مغلوں کے پاس ہی کیونکہ انہوں نے پچھلے سال جیتی تھی۔

سب سپاہی ایک دوسرے کے کندھے تھپتھپارہے ہیں۔ چند شوقین حضرات آٹو گراف لیتے پھر رہے ہیں۔ ہم مائیکروفون کو عین میدان کے لیے چلتے ہیں۔

(آواز آتی ہے)

تھری چیئرز فار مغلز۔۔۔۔

ہپ ہپ ہپ ہُرّے!

ہپ ہپ ہپ ہُرّے!

تھری چیرز فار مرہٹاز۔۔۔۔

ہپ ہپ ہپ ہُرّے!

ہپ ہپ ہپ ہُرّے!

(آوازیں کم ہو جاتی ہیں)

Fade Out

۲۔ عاشق

خواتین و حضرات! شام کے سات بج کر پچپن منٹ ہوئے ہیں۔ ابھی ابھی آپ نے بلیوں کی لڑائی سُنی، کچھ دیر میں ہم جیتے جاگتے عاشق کو براڈ کاسٹ کریں گے۔ پچھلے مہینے ہمیں بے شمار شکایتیں آئیں کہ ریڈیو کا پروگرام خشک ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم اس کی تلافی کر رہے ہیں۔ جن صاحب نے ہمیں یہ مشورے دیئے ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نہیں جانتے کہ ہمیں کِن کِن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور صحیح قسم کے عاشق کی تلاش میں کتنے دنوں مارے مارے پھرے۔ عاشق تو بہت ملتے تھے، لیکن آئیڈیل عاشق نہیں ملتا۔ پرسوں قسمت نے یاوری کی اور ہم نے اسے پالیا۔ اب ہم آپ کو شہر کے کسی گوشے کی کوٹھی میں لیے چلتے ہیں۔ کل ہم اس عاشق کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے۔ آج چپکے سے اسے براڈ کاسٹ کیا جارہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ عاشق کو خود پتہ نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہم اپنی اس حرکت پر پشیمان ہیں لیکن اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ لیجئے، اب اصل پروگرام شروع ہوتا ہے۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے ہیں اور ٹکٹکی باندھے عاشق کو دیکھ رہے ہیں جو اس وقت باغ میں ٹہل رہا ہے۔ عاشق کا حلیہ ہم ہرگز نہیں بتائیں گے۔ ویسے بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے، پبلک عاشق کا حلیہ جانتی ہے۔ تو سامعین اس عاشق نے اپنے محبوب کو کبھی نہیں دیکھا۔ فقط اس کی تعریفیں سنی ہیں۔ بس سُن سُن کر ہی فریفتہ ہو گیا ہے اور ہونا بھی ہو نہی چاہیے۔

ابھی ابھی ایک ناصح یہاں سے برا مُنہ بنائے گیا ہے۔ عاشق کے بزرگوں نے چند Part Time ناصح رکھے ہوئے ہیں جن کا فرض دن میں دو تین مرتبہ سمجھانا

بجھانا ہے۔ لیکن عاشق ان سے بُری طرح پیش آتا ہے اور ہمیشہ انہیں بھگا دیتا ہے اور اکثر شعر پڑھنے لگتا ہے۔ ابھی ابھی اس نے ناصح کو ڈانٹتے ہوئے ایک شعر پڑھا تھا جو ہمیں یاد ہے۔ شعر سن کر ہمارا دل تڑپ اٹھا تھا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ اس نے کہا تھا۔

اب ضرورت ہے ہم کو عینک کی

کوئی صورت نظر نہیں آتی

آہ! کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ کتنا درد ہے اس مصرعے میں؟ یوں تو عاشق ہر وقت کوئی نہ کوئی شعر گنگنا رہتا ہے، لیکن اس کے محبوب شعر صرف چند ایک ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ہم بھی مُنہ میں زبان رکھتے ہیں

کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے

اور دوسرا شعر

اپنی تصویر سامنے رکھ کر

تیرا انجام سوچتا ہوں

سبحان اللہ۔۔۔ تیرا انجام سوچتا ہوں میں۔۔۔۔ کیا سوز مضمر ہے اس میں۔۔۔۔ ایک اور شعر ہے جو وہ عموماً آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر گایا کرتا ہے۔

اپنی صورت کو دیکھتا ہوں میں

اس کی قدرت کو دیکھتا ہوں میں

عاشق نے پیٹ کے بل لیٹ کر چار آہیں بھری، اب اس نے کروٹ لی اور پانچ ٹھنڈے سانس لیے۔ اب وہ سیدھا لیٹ کر چاند کی طرف دیکھ رہا ہے اور مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑا رہا ہے۔

اے لو! وہ لپک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر کاغذات پڑے ہیں۔ عاشق کیا شاعری کر رہا ہے ؟۔۔۔۔ نہیں!۔۔۔۔ اف! یہ تو تارے گِن رہا ہے۔ آسمان کو دیکھتا ہے اور کاغذ پر پُرکار وغیرہ سے نقشہ بنانے لگتا ہے۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ عاشق علمِ ریاضی میں ماہر ہے۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ عاشق نے نامہ بر کے ہاتھ ایک پنسل بھیجی تھی کہ محبوبہ کے ہاتھ سے کسی طرح چھوالائے۔ پھر ایک رومال بھیجا کہ محبوب اس پر چھینک دے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

سامعین! آپ افسردہ نہ ہوں۔ سچّی محبّت میں ایسی باتیں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ دنیا میں رنج والم نسبتاً زیادہ ہیں۔

یہ کون مسخرہ آرہا ہے؟۔۔۔۔۔ اوہ! یہ چارہ گر ہے۔ اس کے ہاتھ میں چاء کا سیٹ ہے۔ اگر عاشق چائے نہ پیئے تو اس کا سٹیمنا ختم ہو جائے۔ عاشق نے جلدی جلدی چاء پی۔ چاء دانی کو ایک پتھر دے مارا، پیالیاں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔ چھلانگیں مارتا ہوا بھاگا اور گھاس کے ایک قطع پر لیٹ کر محبوبہ کو یاد کرنے لگا۔

اتوار کے روز ریگستان کا پروگرام ہوتا ہے۔ عاشق ایک چھوٹی سی ٹوکری میں کھانے پینے کی چیزیں، تھرماس اور چند دیوان ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں صبح سے شام تک ٹیلوں پر بھاگنا، فرضی اُونٹوں کا تعاقب کرنا، دھول اُڑانا، کانٹوں پر ننگے پاؤں پھرنا اور آہ وزاری وغیرہ کرنے کا پروگرام ہوتا ہے۔

وہ اس نے مُنہ میں تھرمامیٹر لگایا اور گھڑی نکال کر نبض گننا شروع کی۔ تھرمامیٹر پڑھا، کاغذ پر ٹمپریچر لکھا اور نبض درج کی۔ یہ اس لیے کہ اس سے گرمیٔ عشق کا اندازہ رہتا ہے۔ اگر ٹمپریچر یا نبض گر جائے تو ظاہر ہے کہ عشق کا جذبہ سرد ہوتا جارہا ہے، چنانچہ جب کبھی یوں ہونے لگتا ہے تو عاشق دُگنے جوش سے اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

سامعین ہم نے یہ چارٹ دیکھا تھا، عاشق کا ٹمپریچر ایک سو ایک اور نبض ڈیڑھ سو تک پہنچ چکی ہے۔ ویسے آج صبح بھی ٹمپریچر خاصا تھا۔ شاید اس لیے کہ آج عاشق کو زکام ہے اور وہ کچھ بیزار بھی ہے۔

عاشق کے کمرے میں ایک گراموفون ہے اور بے شمار ریکارڈ ہیں۔ نوکر ہر پندرہ منٹ کے بعد ایک ریکارڈ لگا دیتا ہے۔ خواہ عاشق باغ میں ہو یا چھت پر۔ چنانچہ اگر آپ اب بھی کانوں پر زور ڈالیں تو مدھم آواز میں ایک ریکارڈ سنیں گے (آواز آتی ہے)

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب

اس کے محبوب ترین ریکارڈ یہ ہیں۔

'ہم تو تنگ آ کے دنیا سے مر جائیں گے'

'کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو'

'تیرے جہاں سے چلے دل میں دل کی بات لیے'

ان ریکارڈوں کے نمبر ہیں۔ تین ہزار پانچ سو سترہ سے بیس تک اور یہ آپ کو نیلے گنبد کی دکان سے مل سکتے ہیں۔

عاشق ایک دو بجے کے قریب بستر پر لیٹ جائے گا جس پر بے شمار سلوٹیں پڑی ہوں گی اور ساری رات آہ وزاری میں گزارے گا۔ خوب کروٹیں لے گا اور شاید ایک دو مرتبہ پلنگ سے نیچے بھی گِر پڑے گا۔ پھر صبح صبح اٹھ کر بھاگتا ہوا دریا کے کنارے جائے گا۔ وہاں پانی کی لہروں سے دل کے راز کہے گا۔ دوپہر تک جنگلوں میں پھرے گا۔ شام کو غروبِ آفتاب دیکھنے کو ایک مینار پر چڑھ جائے گا۔ چاندنی راتوں میں عاشق کی صحت بہت گِر جاتی ہے۔ جب بارش ہو رہی ہو تو اس کی حالت مخدوش ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ترس آنے لگتا ہے۔ اس کی آہ وزاری سے تنگ آ کر اڑوس پڑوس کے تمام ہمسائے مکان خالی کر گئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو دیکھا دیکھی عاشق بن گئے۔

چار مہینوں سے عاشق نے سیر ہو کھانا نہیں کھایا۔ تبھی اس کی جیبوں میں اکثر خشک میوے ملتے ہیں۔ آج کل اس کا گزارہ چاء پر ہے۔

اچھا سامعین !اب ہم اجازت چاہتے ہیں۔ ایک ننھی سی چڑیا ہمارے کان میں کہتی ہے کہ یہ عاشق اس وقت کیا کرے گا جب اپنی محبوبہ کو سچ مچ دیکھ پائے گا۔ نہ تو ہم نجومی ہیں نہ غیب کی باتیں جانتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ !

۳۔ مزدور

کچھ دن ہوئے ہم نے ہوا کی لہروں پر چند شخصیتوں کا انٹرویو پیش کیا تھا۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ یہ ضرور مقبول ہوا ہو گا۔ آج مزدور سے انٹرویو ہو رہا ہے۔

سامعین کبھی آپ نے اس شخص پر بھی غور کیا جسے مزدور کہا جاتا ہے؟ غالباً نہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ مزدور کے سینے میں بھی دل ہے اور اتفاق سے وہ دھڑکتا بھی ہے۔ اس میں جذبہ ہے، احساس ہے، تڑپ ہے۔

آج ہم زمانے بھر کی دُکھیا اور سماج کی ستائی ہوئی روح کی پکار آپ کے کانوں تک پہنچائیں گے۔ سامعین! ہم نہیں چاہتے کہ کمزور دل خواتین و بچّے اسے سُنیں

کیونکہ یہ داستان اس قدر پُر درد ہے کہ ابھی سے ہماری آنکھوں میں آنسو آرہے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ ننھے مُنّے بچّوں اور خواتین کو ریڈیو سے ہٹا دیا جائے۔

مزدور سے ملک کی تین مقتدر ہستیاں انٹرویو کریں گی۔ پہلے جناب نقشین مراد آبادی آئیں گے جو مایہ ناز قومی شاعر ہیں۔ پھر حضرت آوارہ گرد صاحب جو ہندوستان کے چوٹی کے ترقّی پسند افسانہ نویس ہیں۔ آخر میں پنڈت چڑی لڑاوا لکھنوی تشریف لائیں گے جن کے متعلق کچھ کہنا ان کی اور اپنی توہین ہے۔ ہم فقط یہ کہیں گے کہ آج کل کوئی سیاسیات پر قادر ہے تو وہ پنڈت صاحب ہیں۔

یہ لیجئے مزدور کمرے میں آگیا، سلام کرو مائیکروفون کو بھئی مزدور۔۔۔۔۔۔ہاں ہاں۔۔۔۔ شاباش!۔۔۔۔ سامعین مزدور کا سلامِ شوق قبول ہو۔ وہ لیجئے نقشین مراد آبادی بھی تشریف لے آئے۔ اب مکالمے آپ خود سنیے!

(شاعر کی آواز آتی ہے) "آ..... اے غم دیدہ، خمیدہ روح کی پکار۔ مصیبت میں گرفتار۔ اے سماج کے شکار۔ تو ہے اپنی شکست کی آواز۔ بول اے زمانے بھر کے ٹھکرائے ہوئے۔۔۔۔ سرمایہ داری کے ستائے ہوئے۔۔۔۔ اور پھرتا کیوں ہے دربدر تو ہاتھ پھیلائے ہوئے!"

مزدور: ایں؟

شاعر: سر سے لے کر پاؤں تک سُستی سی کچھ چھائی ہوئی۔ اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی۔ نہیں نہیں کیوں نہیں۔ بلکہ اس طرح۔۔۔۔سر سے لے کر پاؤں تک سُستی وستی کچھ آئی ہوئی۔۔۔۔۔اف یہ تیری روح پر بیزاری سی چھائی ہوئی۔۔۔۔۔اب ٹھیک ہے! بول اے فخرِ احمقاں۔۔۔۔ ننگِ خاندان۔۔۔۔۔ سیدھے سادے دہقاں۔۔۔۔ بھولے بھالے انسان۔۔۔۔۔۔بول!"

مزدور: جناب کم از کم گالیاں تو نہ دیجئے!

شاعر: آہ ناداں! انہیں گالیاں سمجھتا ہے۔ آہ ناداں۔۔۔۔۔۔ اُف ناداں۔۔۔۔۔۔۔۔ہائے ناداں

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

ورنہ گلشن میں علاجِ تنگ داماں بھی ہے

مزدور: جناب کسی آسان سی زبان میں باتیں کیجئے۔ میرے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا!

شاعر: تمہارے ابّا کیا کرتے تھے؟

مزدور: مزدور تھے۔

شاعر: اور دادا؟

مزدور: مزدور!

شاعر: اور بیٹا؟

مزدور: وہ بھی مزدور ہے!

شاعر: سبحان اللہ! تمہارا خاندان ہی مزدوروں کا ہے۔ میں تو مزدوروں پر جان چھڑکتا ہوں۔ ہمارا سب خاندان مزدوروں پر مَر مِٹا ہے۔ میں نے کیا کہا تھا؟۔۔۔ مَر مِٹا ہے! ہاں! ایک شعر عرض ہے۔

تیرے سب خاندان پر عاشق

میرا سب خاندان ہے پیارے"

مزدور: کیا کہا؟۔۔۔ پھر سے کہنا ذرا۔۔۔ دیکھئے صاحب میں۔۔۔

شاعر: بس بس! ہشت! اچھا۔ کبھی یہ شعر بھی سنا؟

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے خوشۂ گندم کو جلا دو

سنا ہے کبھی یہ شعر؟

مزدور: نہیں سنا!

شاعر: اور جب رات کی سیاہی رخصت ہوتی ہے اور صبح کا نور آسمان سے زمین تک لہریں مارتا ہے تو اس وقت تم کیا کرتے ہو؟

مزدور: کیا فرمایا آپ نے؟

شاعر: یعنی صبح کو کیا کرتے ہو؟

مزدور: میں ورزش کرتا ہوں صبح اٹھ کر۔

شاعر: ورزش؟ چچ چچ! اور جب آفتاب عین نصف النہار پر ہوتا ہے اور زمین پر اپنی تیز کرنیں پھینکنے سے باز نہیں آتا، دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں کِن مشقتوں سے دوچار ہوتے ہو؟

مزدور: کھانا کھا کر سو جایا کرتا ہوں۔

شاعر: اور جب شام کے دلفریب لمحے دن بھر کے تھکے باشندوں کو مسرت کا پیغام سناتے ہیں، اس وقت کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے ہو؟

مزدور: اکھاڑے میں ورزش کرتا ہوں۔

شاعر: ورزش! ورزش! ہم بھی ورزش کرتے ہیں، لیکن ڈینگیں نہیں مارتے تمہاری طرح! صبح اُٹھ کر ہم دو ڈنٹر پیلتے ہیں، پانچ بیٹھکیں نکالتے ہیں اور پندرہ مرتبہ لمبے لمبے سانس لیتے ہیں۔ شام کو ہم پچاس قدم تیزی سے چلتے ہیں؟

اناؤنسر: ہمیں افسوس ہے، نقشین صاحب نے اتنے دیر بھی لگائی اور ایک بات بھی کام کی نہ کی۔ خفا نہ ہوں نقشین صاحب! ہم بات خدا لگتی کہتے ہیں۔ آہا ہمیں ایک شعر یاد آ گیا۔

بات سچّی ہے بے مزا لگتی ہے

میں کہوں گا مگر خدا لگتی ہے

اچھا! آوارہ گرد صاحب! اب آپ تشریف لے آیئے۔ آوارہ گرد صاحب کے افسانے محض مزدوروں کے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ مزدوروں کی رَگ رَگ سے واقف ہیں اور مزدور ان کی رَگ رَگ سے۔ لیکن آوارہ گرد صاحب! یاد رہے کہ سوالات نپے تلے ہوں۔ مختصر ہوں اور با معنی ہوں۔ اِدھر آ جایئے۔ یہ لیجئے اب آپ خود سنئے!

آوارہ گرد: بھئی مزدور! جب تم کسی امیر آدمی کو دیکھتے ہو گے تو تمہارا خون ضرور کھولنے لگتا ہو گا؟

مزدور: "نہیں تو!

ادیب: نہیں؟ غضب خدا کا! اور جب تم کسی خوش پوش شخص کو موٹر میں دیکھتے ہو تو سماج پر لعنت ملامت نہیں بھیجتے؟

مزدور: سماج کیا ہوتا ہے؟ اور میں کبھی کسی کو گالی نہیں دیتا۔ یہ بہت بُری بات ہے۔

ادیب: تمہیں خیال تو آتا ہو گا کہ یہ شخص موٹر میں کیوں بیٹھا ہے!

مزدور: اس لیے کہ اس کے پاس موٹر ہے!

ادیب: اوں ہوں! وہ تو ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں ہے اس کے پاس موٹر؟

مزدور: اس نے موٹر خریدی ہے۔

ادیب: تم سرمایہ داری کی اس لعنت پر نفرت کی بوچھاڑ ڈالتے ہوئے مساوی حقوق کے لیے کوشاں ہونا اپنا فرض اولین تصور نہیں کرتے؟

مزدور: قسم لے لو جو ایک لفظ بھی سمجھ میں آگیا ہو۔ ابھی وہ دبلے پتلے سے آدمی بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔

ادیب: مثلاً تم یہ نہیں سوچتے کہ آخر امیر امیر کیوں ہیں؟ اور غریب غریب کیوں ہیں؟ سارے امیر غریب کیوں نہیں بن جاتے؟ اور غریب امیر کیوں نہیں ہو جاتے؟ کہ جو غریب غربت میں غریبی کے متعلق غریبانہ!

اناؤنسر: آوارہ گرد صاحب! افسوس ہے کہ ہم آپ کو ٹوک رہے ہیں۔ بھلا آپ غریبی کی گردان کیوں کر رہے ہیں؟

ادیب: اف! معاف کیجئے! ہاں بھئی مزدور، تم امیر آدمیوں سے دل میں دشمنی ضرور رکھتے ہو گے۔

مزدور: نہیں دل میں کبھی کسی سے دشمنی نہیں رکھنی چاہیے۔ دل صاف ہو تو اچھا ہے۔ اور پھر سارے انسان برابر ہیں۔

ادیب: تم عجیب و غریب مزدور ہو۔ نہ تم ان کے خلاف ہو نہ سرمایہ داری کو برا کہتے ہو۔ امیروں سے بھی نفرت نہیں کرتے۔ تعجّب ہے! اب کیا خاک پوچھوں تم سے؟

اناؤنسر: اچھا آوارہ گرد صاحب! آپ کا انٹرویو ختم ہوا۔ اب پنڈت چڑی لڑاوا صاحب آ رہے ہیں۔ آخر میں مزدور چند الفاظ میں اپنی درد بھری داستان سنائے گا۔ سامعین! ہم ایک مرتبہ پھر یاد دہانی کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ اگر کمزور دل خواتین یا بچّے ریڈیو سُن رہے ہیں تو انہیں براہِ کرم دوسرے کمرے میں بھیج دیا جائے۔ مزدور کی کہانی اس کی اپنی زبانی اتنی غم ناک ہو گی کہ پنڈت صاحب نے ابھی سے رونا شروع کر دیا ہے۔ آ جایئے پنڈت صاحب! روئیے مت! آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اور بھئی

مزدور یہ تم چلغوزے وغیرہ بعد میں چبا لینا، عجب بے صبرے آدمی ہو تم بھی۔ پنڈت بھی تمہاری حالت پر رو رہے ہیں اور تم ہو کہ مُنہ چلا رہے ہو۔۔۔۔۔تو سامعین سُنئے !

پنڈت جی: (گرجتی ہوئی آواز میں رُک رُک کر۔) اے ہندوستانی قومیت کے پرستار ہم تجھے سلام کرتے ہیں۔

مزدور: وعلیکم السّلام!

اناؤنسر: ہشت!

پنڈت جی: ہاں! اے ہندوستانی قومیت کے پرستار ہم تجھے سلام کرتے ہیں۔ اے ہندوستانی تہذیب کے علمبردار!

مزدور: میں نمبر دار نہیں ہوں۔ میں تو۔۔۔

پنڈت جی: مت ٹوک مجھے یہ لفظ نمبر دار نہیں تھا بلکہ علمبردار تھا۔ آہ! تمہارے بھولے پن نے میرے دل پر رقت طاری کر دی۔ میرے قلب میں انتشار پیدا کر دیا۔ تمہارے دل میں ایک

انقلاب کی خواہش کروٹیں نہیں لیتی کیا؟ کبھی کبھی تمہارے سینے میں گُدگُدیاں نہیں اُٹھتیں۔۔۔۔۔ نہیں اُٹھتیں کیا؟

مزدور: جناب سینے میں نہیں گُدگُدیاں پیٹ میں ہوا کرتی ہیں۔

پنڈت جی: اف ان گُدگُدیوں کا ذکر کون مسخرہ کر رہا ہے؟ دل میں دل کی گُدگُدیوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ وارداتِ قلب کا ذکر ہو رہا ہے۔ میرے بھولے بھالے کامریڈ تم صرف انقلاب چاہتے ہو گے، ہم خود انقلاب چاہتے ہیں، چاہتے رہے ہیں۔۔۔ چاہتے ہیں۔ چاہیں گے اور چاہتے رہا کریں گے۔ اور اس انقلاب میں ہم تمہیں لڑائیں گے۔ آہ! مزدور لڑیں گے۔ دل سہم جائیں گے۔ اناؤنسر صاحب ذرا ایک گلاس پانی منگا دیجئے۔۔۔۔۔ ہاں! انقلاب چاہتے ہو نا سچ سچ بتاؤ۔

مزدور: نہیں جناب میں بے قصور ہوں، بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے کبھی ایسی خطرناک باتیں نہیں سوچیں۔ مجھے معاف کر دیجیے۔

پنڈت جی: پھر وہی بھولپن دکھا رہے ہو میرے جگری دوست۔ میں تمہارے راز سے واقف ہوں۔ سمجھ لو کہ

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے

دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

مزدور: (گھبرا کر) صاحب آپ میری تلاشی لے لیجیے۔۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔

پنڈت جی: مجھے ہنسنے کی اجازت دو۔ ہاہاہاہا۔۔۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی۔۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔۔۔ کامریڈ۔۔۔ کس قدر سادہ لوح ہو تم۔۔۔۔ اور جب وہ انقلاب آ جائے گا تو پھر ہماری مشکلات حل ہو جائیں گی۔ موجودہ کساد بازاری رفع ہو جائے گی۔ مسرت و شادمانی کی لہر ملک کے گوشے گوشے میں دوڑ جائے گی۔ یا تو سب باشندے غریب ہی ہوں گے یا سب کے سب امیر ہوں گے اور یا یہاں باشندے ہوں گے ہی نہیں!

اناؤنسر: یہ لیجیے پانی کا گلاس۔ پنڈت جی، گستاخی معاف، یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟

پنڈت جی: اوہ! وہ شعر سُنے ہیں آپ نے؟

اکثر بہک جاتا ہوں میں

مُنہ آئی بک جاتا ہوں میں

ایسا شرابی ہو گیا

عقل و خرد کو کھو گیا

مجھ کو زمانے سے غرض

پینے پلانے سے غرض

آہ!۔۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟

اناؤنسر: اف! پنڈت جی خدا کے لیے بے ہوش مت ہوئیے۔

پنڈت جی: آئے ہائے! اناؤنسر صاحب رہا نہیں جاتا۔ کیا کروں؟

اناؤنسر: صبر سے کام لیجیے۔ خدا کے لیے پنڈت جی!

(دھڑام سے کوئی گر تا ہے)

اناؤنسر: سُنا آپ نے؟ پنڈت چڑی لڑاوا صاحب کیا تو ابھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور کیا بے ہوش ہو گئے۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ ہمیں ایک شعر یاد آیا ہے۔ جمع رکھئے پنڈت جی کو ایسے دورے اکثر پڑا کرتے ہیں۔ کیوں نہ ہو ملک کے صدمے سہ سہ کر دل بالکل چھوٹا سا ہو گیا ہے۔ بعض اوقات تو ہمیں شُبہ ہوتا ہے کہ پنڈت جی کا دل سوچ بچار میں گھِس گھِس کر غائب ہو چکا ہے۔ لو بھئی مزدور تم اپنی تقریر شروع کر دو۔۔۔۔ اِدھر آؤ۔۔۔۔ اس طرف۔۔۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔۔ شرماؤ نہیں۔۔۔۔۔ اپنی زندگی کی ناکامیوں پر روشنی ڈالو۔۔۔۔۔!

مزدور: جناب! میں ایک تندرست آدمی ہوں۔ صبح کو ورزش کرتا ہوں اور شام کو بھی اور اچھی خاصی غذا کھاتا ہوں۔ پھر جی بھر کر سوتا ہوں۔ اکھاڑے میں بھی جاتا ہوں اور اچھے اچھے پٹھوں کو پچھاڑ لیتا ہوں۔ پانچ چھ گھنٹے مزدوری کرتا ہوں۔ دن بھر کے لیے کافی مل

جاتا ہے بلکہ کچھ بچ ہی جاتا ہے۔ یہ عجیب سے لوگ مجھے بلا کر یہاں لے آئے ہیں اور عجیب عجیب باتیں پوچھ رہے ہیں۔ میں ناشکرا نہیں، نہ میں کسی امیر کی پروا کرتا ہوں، نہ نمبر دار کی۔ نہ میں کسی کو برا بھلا کہتا ہوں۔ میری صحت ایسی ہے کہ جتنے آدمی یہاں بیٹھے ہیں ان سب کو ِگرا سکتا ہوں۔ مجھے بولنے دیجیے۔ یہ دیکھئے ان لوگوں نے دھینگا مُشتی شروع کر دی ہے۔ ارے۔۔۔۔ ذرا۔۔۔۔!

اناؤنسر: اف سامعین ہمیں معاف فرمایئے۔ ہم نادم ہیں۔ اس مزدور نے تو سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ پروگرام بالکل خراب ہو گیا ہے۔ حضرت نقشین مراد آبادی نے سوال کام کے نہیں کیے۔ آوارہ گرد صاحب چِڑ گئے۔ پنڈت بھی بے ہوش ہو گئے اور یہ مزدور کشتی لڑنے کو تیار ہے۔ ہم شرمندہ ہیں۔ اچھا۔۔۔۔۔ اب ہم قبل از وقت یہ فیچر ختم کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی تلافی عنقریب کر دی جائے گی جب ہم بقیہ مشورے پیش کریں گے۔ ان کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔

ایک قدرتی نظارہ

پنگھٹ

ایک آپریشن

ایک خفیہ جلسہ

اور ایک آدھ صحیح قسم کا انٹرویو بھی کرا دیں گے۔ اچھا آداب عرض!

دیکھئے صفحہ فلاں

آرام کرسی پر بیٹھ کر (بلکہ لیٹ کر) کوئی دلچسپ افسانہ پڑھا جارہا ہے۔ کچھ معلوم نہیں چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کمرے میں آہٹ ہے تو قالین پر کتّا پھر رہا ہے یا بلّی یا کہیں پڑوس کے مالی کی بکری ہی تو نہیں۔

یہ بھی معلوم نہیں کہ اب کیا بجا ہے اور کتنے بجے سے کالج میں لیکچر شروع ہو گیا یا کب سے شروع ہو چکا ہے اور ابھی ابھی جو جلتا ہوا سگریٹ پھینکا تھا وہ کہیں قالین پر تو نہیں وہ گیا۔ آنکھیں کچھ مُندی مُندی سی ہیں۔ کچھ خواب سے دیکھے جارہے ہیں۔ ایک داستانِ محبّت ہے کہ سامنے کھلی ہوئی ہے۔ یہ شُبہ یقین میں تبدیل ہوتا جارہا ہے کہ واقعی محبّت بھی کوئی بڑی شدید قسم کا جذبہ ہے اور جس کسی کو محبّت ہو جائے اس جیسا خوش قسمت آس پاس نہیں ملتا۔ یہ خدا کی دین ہے جسے وہ محبّت عطا کرتا ہے تو بس چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔ تلاش کرنے پر تو ہی ملتی نہیں،

لیکن اگر چمٹ جائے تو کمبل کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آہاہاہا۔ مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔

خیالات بھی افسانے کے کرداروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے ہیں، جب درد ناک حصّہ شروع ہو جاتا ہے تو مُنہ لٹک جاتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو آتے ہیں۔ ایک آدھ آہِ سرد بھی کھینچ لی جاتی ہے۔ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی بخار چڑھے گا۔ پھر جب محبّت کی فتح کا وقت نزدیک آتا ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر مُسکراہٹ آ جاتی ہے۔ سر کسی نامعلوم تال پر ہلنے لگتا ہے۔ طبیعت میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ خواہ مخواہ کسی سے لڑنے کو جی چاہتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح افسانے کی ایک ایک سطر کے ساتھ پینترے بدلے جاتے ہیں۔ انھی خیالات میں مدہوش ہوتے ہیں کہ ایک زور دار کڑاکے کے ساتھ بجلی گرتی ہے۔ یکلخت طوفان آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ پھر آنکھوں کے سامنے ایک خلا چھا جاتا ہے۔ ایک وسیع خلاء! خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔

یہ سارا سلسلہ کچھ اس طرح منقطع ہو جاتا ہے جیسے سینما ہال میں فلم یک لخت ٹوٹ جائے۔ نیچے لکھا ہوا ہے۔ ”باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر۔“

خدایا! یہ کیا ہو گیا؟ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

لیکن قہرِ درویش بر جانِ درویش! سب کچھ سہنا پڑتا ہے اور صفحہ فلاں کھول کر پھر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن اس مرتبہ وہ جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔

بعض اوقات تو ایسے موقعوں پر نہایت وحشیانہ خیالات آنے لگتے ہیں۔ کئی مرتبہ ہونٹ دبا دبا کر مُکّے کسے جاتے ہیں اور ایسے ایسے منصوبے باندھے جاتے ہیں جن کا ذکر کرنا خالی از خطرہ نہ ہو گا۔

مثلاً ایک دل ہلا دینے والا خونچکاں افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ ہیروئن نے پیار سے کہا، "یوں ٹال مٹول کرنے سے فائدہ؟ میں ہمیشہ سچّے انسان کو پسند کرتی ہوں۔ آپ جو مجھ سے کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں، اس کی وجہ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔ اصل بات کیا ہے۔ خدا کے لیے صاف صاف بتا دیجئے۔"

ہیرو نے کہا۔ "آہ! یوں کہوں تو بھی مشکل، ووں کہوں تو بھی مشکل۔۔۔۔۔ تم مانو گی نہیں!"

ہیروئن بولی۔ "یہ آپ میں اتنی تبدیلی کیسے آ گئی؟ التجائیں کر رہی ہوں پھر بھی آپ نہیں بتاتے۔"

ہیرو بولا۔ ”اچھا تو سن، صاف کہے دیتا ہوں۔۔۔۔۔ لیکن کیسے بتاؤں؟۔۔۔۔ اچھالو سُنو۔۔۔۔ مَیں کس طرح تمہیں سمجھاؤں کہ۔۔۔۔۔“

آگے آتا ہے۔۔۔ ”میں خود اصلی یاقوتی کے استعمال سے مستفیض ہو چکا ہوں۔ دنیا بھر کے ڈاکٹر میرے مرض کو تپ دق بتاتے تھے میں بالکل ہڈیوں کی مالا بن گیا تھا اور اب بفضلِ خدا قابلِ رشک صحت کا مالک ہوں۔“

طبیعت میں الجھن سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ کیا ہو گیا؟ اس کا افسانے سے تو کوئی تعلق نہیں۔ اظہارِ محبّت سے اصلی یاقوتی کا کیا واسطہ؟

صفحات کی جانچ پڑتال جو کی جاتی ہے تو بڑی کوفت ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی اشتہار تھا۔

بعض اوقات افسانہ پڑھتے وقت اس آنے والے خطرے سے دل اچانک دھڑکنے لگتا ہے کہ کہیں یک لخت یہ حادثہ پیش نہ آجائے جہاں افسانے کا کوئی دلچسپ حصّہ آتا ہے اس وقت تو بس جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو کی قسم کا ورد شروع ہو جاتا ہے کہ اے پاک پروردگار! کہیں دیکھئے صفحہ فلاں نہ بیچ میں آپ

ٹپکے اور اگر یونہی ہونا لکھا ہے تو ذرا دیر میں آئے جب یہ دلچسپ حصّہ ختم ہو لے۔

کتنی ہی مرتبہ مسلسل ناکامیوں سے دل بیزار ہو گی اور ان لگاتار بیزاریوں نے مجھے انسانوں کے معاملے میں ایک حد تک قنوطی بنا دیا۔ افسانے کی سرخی دیکھتے ہی سامنے بے ثباتیٔ عالم کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں اس افسانے کا حشر بھی وہی نہ ہو جو اتنے افسانوں کا ہوتا دیکھا ہے۔

مَیں نے کیسے کیسے جتن کئے ہیں؟ مثلاً یہ کہ سب سے پہلے افسانے کے عنوان سے لے کر اختتام تک سارے صفحات کا جائزہ لیا۔ اگر افسانے میں دیکھئے فلاں صفحہ نہیں ہے۔ (یہ نعمت بہت شاذ ہے) تو فوراً کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس افسانے کو جلدی جلدی پڑھ لیا۔ ایسے مسرور لمحات پر بارہا خوشی کے آنسو بہائے ہیں لیکن جلد ہی پونچھ ڈالے کیونکہ ایسی خوشی دیرپا نہیں ہوتی اور اگلے افسانے میں ضرور کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ان افسانوں کو چُنا جن میں دیکھئے صفحہ دو مرتبہ ہو یا زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ ہو۔ جلدی سے دو انگلیاں ان صفحات میں رکھ لیں اور روانی قائم رکھنے کے لیے اِدھر آخری پیرے کو دو تین مرتبہ پڑھا اور پھر بڑی پھرتی سے

(جس کی مشق کافی دیر میں ہوتی ہے) بقیہ حصّہ نکالا اور جلدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں کرتے وقت اکثر بلند آواز سے پڑھنا پڑتا ہے۔

اور جن افسانوں میں دیکھیے صفحہ پانچ چھ مرتبہ ہو تو انہیں زندگی کے صرف ان لمحات کے لیے وقف کر رکھتا ہوں جب انسان افسانہ پڑھے بغیر نہ رہ سکے۔ کئی مرتبہ ایسے افسانے بھی دیکھے ہیں جن میں افسانہ کم ہوتا ہے اور دیکھیے صفحہ فلاں زیادہ!

رومانی افسانے تو ایک طرف، علمی مضامین اور ڈراؤنی کہانیاں بھی اس دیکھیے صفحہ فلاں کی دست بُرد سے نہیں بچتیں۔ مثال کے طور پر سراغ رسانی کے اس افسانے کو لیجیے۔

"۔۔۔ بالکل اندھیری رات تھی۔ بارش نے سوچ رکھا تھا کہ بس آج ہی برسوں گی۔ قبرستان کا منظر تھا اور ہوا کے تھپیڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑی مصیبت ٹوٹے والی ہے۔"

یہ پڑھ کر دل پر تھوڑا سا خوف ضرور طاری ہونے لگتا ہے۔ خصوصاً اگر اندھیری رات میں افسانہ پڑھا جائے اور ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی ہو۔ "تیز بارش میں

ملزم سَرپَٹ بھاگا۔ اس کے پیچھے پیچھے کانسٹیبل تھا۔ اس قسم کے تعاقب کا اتفاق کانسٹیبل کو کبھی نہیں ہوا تھا۔ ملزم کے پاؤں میں گویا پہیے لگے ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے چلّا کر کہا۔ بدمعاش تو بچ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ میں سیٹی بجاتا ہوں ابھی کئی سپاہی تجھے گھیر لیں گے۔۔۔۔۔"

لیکن ملزم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے قلانچ بھری، برساتی نالے کو پھلانگ گیا اور لپک کر سامنے کی اونچی دیوار پر چڑھ گیا۔ بھاری بھرکم کانسٹیبل پھاند نہ سکا اور وہیں رُک گیا۔ ملزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا۔

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر۔

دل پر بدستور ڈر حاوی ہے۔ صفحہ تلاش کرتے وقت آخری فقروں کو دہرایا جارہا ہے۔ بقیہ حصّہ مِل جاتا ہے۔ آخری فقرہ پڑھا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ہاں تو۔۔۔۔۔ ملزم نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّا کر بولا کہ "خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے۔" یہ کیا تماشا ہے؟ کہاں تو سہمے بیٹھے تھے اور کہاں کچھ ہنسی آجاتی ہے۔ ملزم کانسٹیبل سے کہہ رہا ہے کہ نمبر خریداری کا حوالہ دیجئے۔

دوبارہ دیکھتے ہیں کہ کہیں غلط تو نہیں پڑھ لیا۔ خاصی چھان بین کے بعد پتہ چلتا ہے کہ واقعی کچھ اور پڑھ لیا ہے۔ اب جو افسانے کو پڑھتے ہیں تو وہ ملزم کا پُر لطف فقرہ بھولتا ہی نہیں۔ ہنسی ہے کہ زبردستی آرہی ہے۔ بس افسانہ ختم۔

اب کوئی سنجیدہ سا مضمون نکالتے ہیں۔ سقراط پر مقالہ ہے اور خوب ہے۔ دفعتاً پتہ چلتا ہے کہ سقراط واقعی بہت بڑی ہستی تھی اور اب تک ہم بالکل اندھیرے میں رہے ہیں کہ ہم نے اس عظیم روح پر کبھی فاتحہ تک نہ پڑھی۔ اپنی بے بضاعتی پر افسوس ہونے لگتا ہے۔

پھر سقراط کو زہر دیئے جانے کا سین آتا ہے۔ دل پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ چہرہ لمبا ہو جاتا ہے۔ مُسکراہٹ (ملزم کے فقرے والی مُسکراہٹ) آہستہ آہستہ دُور ہو جاتی ہے۔ یک لخت انکشاف ہوا ہے کہ دنیا فانی ہے۔ یہاں سب کو مرنا بھی ہے۔ فاضل مضمون نگار لکھتے ہیں: ”سقراط نے پہلے تو اپنے دشمن کو بڑے سکون سے دیکھا۔ اس کے پُر نور چہرے کا جلال کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ وہ بالکل ہراساں نہ تھا۔ دشمنوں کا پِتّا پانی ہو چلا تھا۔ سقراط نے ایک چھینک ماری اور کہا۔۔۔۔ شکر ہے۔ پھر زہر کا پیالہ ہاتھ میں لے کر گرجتی ہوئی آواز میں بولا:

باقی دیکھئے صفحہ فلاں پر“

جلدی سے کھول کر پڑھا؟ ہاں تو سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "اگر آپ سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو سالانہ چندہ پیشگی بھیج دیجئے۔" یہ کیا مصیبت ہے پھر واپس پہنچے۔ اس مرتبہ بڑے احتیاط سے سب کچھ دیکھا پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے ایسے وقت۔ پھر آہستہ سے یہ صفحہ کھولا۔ اب جو پڑھتے ہیں۔ سقراط نے گرجتی ہوئی آواز میں اپنے دشمنوں سے کہا کہ "ہمیشہ عبداللہ سگریٹ پیا کرو" تو بھُنّا کر رسالہ پٹخ دیا۔ اگر محض اتنا ہی ہو کہ دیکھئے فلاں صفحہ کے ساتھ اس صفحے پر صرف اس مضمون کا بقیہ حصّہ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔ اب ایک ہی صفحے پر تین چار چھوٹے چھوٹے تراشے مضامین کے حصّوں کے ہیں۔ چند بیش قیمت نصیحتیں خریداروں کو دی گئی ہیں۔ ایک آدھ اشتہار بھی ہے۔ اب بتایئے کیا پڑھیں اور کیا نہ پڑھیں!

یا تو یوں ہوا کہ کھولے صفحہ ۱۹ دیکھئے وسط کا حصّہ، ڈھونڈیے دوسرا کالم اور پڑھیے گیارہویں سطر۔

شاید اس کا ایک فائدہ بھی ہے۔ کسی بیکار سے افسانے کو پڑھتے پڑھتے جب نہایت خشک حصّہ آ جائے اور جی چاہے کہ پھینکو اسے ایک طرف، تب ضمیر ڈانٹتا ہے کہ خبردار! یہ آرٹ کی توہین ہے۔ اگر اتنے ہی بیزار تھے تو شروع کیوں

کیا تھا۔ اب شرافت اسی میں ہے کہ اسے لفظ بہ لفظ پڑھ کر ختم کرو۔ اس وقت انسان بہانے ڈھونڈنے لگتا ہے اور سب سے معقول بہانہ یہی ہو سکتا ہے جہاں متواتر دیکھئے فلاں صفحہ آئے، وہاں ایک آرٹ کے شیدائی کو پورا حق حاصل ہے کہ بے شک رسالے کو انگیٹھی میں ڈال دے یا اگر گرمیاں ہو تو کھڑکی سے باہر پھینک دے۔ اور اگر ضمیر ذرا سا بھی بولے تو اُلٹا اسے ڈانٹ دے۔

لوگ اکثر لکھا کرتے ہیں کہ جب میں اسمبلی میں پہنچوں تو یہ کروں گا۔ اگر بڑا آدمی بن جاؤں تو یہ منوا کر ہٹوں گا۔ اگر لیڈر بن گیا تو یوں سے یوں ہو جائے گا۔ مجھے تو یہی دھن ہے کہ اگر کسی روز اتفاق سے بڑا آدمی بن گیا (واضح ہو کہ میں اپنے قد پر قانع ہوں اور بڑے آدمی سے میرا اشارہ طول و عرض کی جانب ہر گز نہیں) چنانچہ اگر میں کبھی بڑا آدمی بن گیا تو سب سے پہلے اس دیکھئے صفحہ فلاں کے خلاف آواز بلند کروں گا کہ کسی کو کیا حق ہے کہ ایک نفیس سے افسانے یا مضمون کی تِکّا بوٹی کر کے رکھ دے اور پھر جیسا کہ بعض مصنّفین نے کہا ہے (بہت سے آج کل بھی کہتے ہیں) کہ مضامین جگر کے ٹکڑے ہوتے ہیں تو اس صورت میں تو یہ ایک اچھا خاصا جرم بن سکتا ہے۔

امید ہے کہ لوگ اس اپیل کو سر آنکھوں پر لیں گے اور وہ دن دُور نہ ہو گا جب دیکھیئے صفحہ فلاں مُردہ باد اور دیکھیئے صفحہ فلاں "ہائے ہائے" کے نعرے بچّے بچّے کی زبان پر ہوں گے۔ پھر افسانے سالم چھپا کریں گے، مسلسل ہوں گے اور پڑھنے والوں کو ہرگز یہ مشکلات پیش نہ آئیں گی۔ جب تک اس قسم کا قانون نہیں بنتا، سمجھ لیجئے کہ دیکھیے فلاں صفحہ بھی کہیں نہیں جائے گا اور اسی طرح مدّتوں ہمارے سینے پر مونگ دلے گا۔

ایک مشورہ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اگر ضرور ہی ایک افسانے کو کئی حصّوں میں تقسیم کرنا منظور ہے اور اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا تو اس خشک سے فقرے کی جگہ بہتر فقرے بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ سخت سا نادر شاہی حکم بار بار اچھا نہیں لگتا۔

جہاں مضمون کا کوئی حصّہ ختم ہوتا ہے وہاں ملائم الفاظ میں پڑھنے والے سے درخواست کی جائے کہ چونکہ اس صفحے پر جگہ تھوڑی تھی اور دوسرے صفحے سے نیا مضمون لازمی طور پر شروع ہوتا تھا اس لیے اگر وہ مناسب سمجھے تو فلاں صفحہ کھول لے۔ مثلاً۔۔۔۔

اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کم از کم فلاں صفحہ ہی کھول لیجئے۔

یا

گستاخی معاف! کیا آپ ہمارے لیے فلاں صفحہ نہ کھولیں گے!

یا

صفحہ فلاں کو ملاحظہ فرما کر مدیر و مینجر رسالہ ہذا و عملۂ متعلقہ رسالہ ہذا و فاضل مضمون نگار۔ سب کو ممنون فرمایئے۔

شکریہ!

شیطان

اس رات اتفاق سے میں نے شیطان کو خواب میں دیکھ لیا۔ خواہ مخواہ خواب نظر آگیا۔ رات کو اچھا بھلا سویا تھا نہ شیطان کے متعلق کچھ سوچا نہ کوئی ذکر ہوا نہ جانے کیوں ساری رات شیطان سے باتیں ہوتی رہیں اور شیطان نے خود اپنا تعارف نہیں کرایا کہ خاکسار کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ فقط ذہنی تصویر تھی جس سے شُبہ ہوا کہ یہ شیطان ہے۔ چھوٹے چھوٹے نوک دار کان، ذرا ذرا سی سینگ، دُبلا پتلا، بانس جیسا لمبا قد۔ ایک لمبی دُم جس کی نوک تیر کی طرح تیز تھی۔ دُم کا سرا شیطان کے ہاتھ میں تھا۔ میں ڈرتا ہی رہا کہ کہیں یہ چبھو نہ دے۔ نرالی بات یہ تھی کہ شیطان نے عینک لگا رکھی تھی۔ رات بھر ہم دونوں نہ جانے کِس کِس موضوع پر بحث کرتے رہے۔

اب صبح چائے کی میز پر بیٹھتے ہیں تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ روفی کی شکل بالکل شیطان سے ملتی تھی۔ شکل کیا حرکتیں بھی وہی تھیں۔ ویسا ہی قد، وہی چھوٹا سا چہرہ، لمبی گردن، ویسی ہی عینک، وہی مکّار سی مُسکراہٹ۔

مجھ سے نہ رہا گیا چپکے سے رضیہ کے کان میں کہہ دیا کہ روفی شیطان سے ملتے ہیں۔ وہ بولی آپ کو کیا پتا؟ کہا کہ ابھی ابھی تو میں نے اصلی شیطان کو خواب میں دیکھا ہے۔ حکومت آپا رضیہ کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جو ہمیں سرگوشی کرتے دیکھا تو بس بے قابو ہو گئیں۔ فوراً پوچھا کیا ہے؟ رضیہ نے بتا دیا۔ حکومت آپا کو تو ایسا موقع خدا دے۔ بس میز کے گرد جو بیٹھا تھا اسے معلوم ہو گیا کہ روفی کا نیا نام رکھا جا رہا ہے۔ لیکن محض خواب دیکھنے پر تو نام نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ ویسے روفی نے ہمیں تنگ بہت کر رکھا تھا۔ بچّوں تک کی خواہش تھی کہ ان کا نام رکھا جائے۔

ہم چاء ختم کرنے والے تھے۔ مجھے دوسرے آملیٹ کا انتظار تھا اور رضیہ کو پتا نہیں کس چیز کا۔ کالج میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا اس لیے مزے مزے سے ناشتہ کر رہے تھے۔ اتنے میں ننھا حامد بھاگا بھاگا آیا۔ اس کے سکول کا وقت ہو گیا تھا اس لیے جلدی میں تھا۔ یہ روفی کے برابر بیٹھ گیا۔ حامد کو بخار ہو گیا تھا۔ تبھی

اس کی حجامت ذرا باریک کروائی گئی تھی۔ روفی نے بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے حامد کے سر کو دیکھا۔ جونہی حامد نے ٹوسٹ کھانا شروع کیا۔ روفی نے ایک ہلکا سا تھپڑ حامد کے سر پر جما دیا۔ اور میں نے فوراً رضیہ سے کہہ دیا کہ سچ مچ روفی شیطان ہی ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر کوئی ننگے سر کھائے تو شیطان دھول مارتا ہے۔ حکومت آپا چونک کر ہماری جانب متوجّہ ہوئیں۔ ان کو پتا چلنا تھا کہ سارے کُنبے کو معلوم ہو گیا کہ آج سے روفی شیطان کہلائے جائیں گے۔

یہ تھا وہ واقعہ جس کے بعد روفی شیطان مشہور ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں ہر ایک کی زبان پر یہ نام چڑھ گیا۔ یہاں تک کہ خود روفی نے اس نام کو بہت پسند کیا۔

روفی اور میں بچپن کے دوست تھے اور مجھے ان کی سب کہانیاں یاد تھیں۔

جب ہم بالکل چھوٹے چھوٹے تھے تو ایک دن روفی کو ان کی نانی جان تاریخ پڑھا رہی تھیں۔ جب پتھر اور دھات کے زمانے کا ذکر آیا تو روفی پوچھنے لگے۔ نانی جان! آپ پتھر کے زمانے میں کتنی بڑی تھیں؟ پھر کہیں سقراط اور بقراط کا ذکر ہوا۔ یہ بولے۔ ”نانی جان سقراط اور بقراط کیسے تھے؟“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے پوچھا۔

"آپ نے تو دیکھے ہوں گے۔" جواب ملا۔

ہر وقت روفی کو کچھ نہ کچھ سوجھتی رہتی تھی۔ ہمارے سکول کے سامنے جو سڑک تھی اس پر بیشمار گھوڑے گزرا کرتے تھے (مع سواروں کے) کوئی سوار مزے سے جا رہا ہے۔ یکایک روفی چلّائے۔ "جناب! سنیئے ذرا۔۔۔ گھوڑے کی دُم گِر گئی ہے۔ اٹھا لیجئے۔ ورنہ گھوڑا النڈورا رہ جائے گا۔" اور سوار فوراً چونک کر ٹھہر جاتا ہے اور پیچھے مُڑ کر دیکھتا۔ خاص طور پر گھوڑے کی دُم کو تو ضرور چیک کرتا۔

ایک دن روفی کلاس میں طوطا لے آئے۔ پوچھا، یہ کیا؟ بولے۔ "ابھی پچھلے مہینے میں نے پڑھا ہے کہ طوطا سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ میں نے سوچا سُنی سُنائی کا کیا اعتبار؟ خود تجربہ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔" استاد صاحبان سے تو ہمیشہ نوک جھونک رہتی تھی۔ ایک روز ماسٹر صاحب نے چہل قدمی کے معنے پوچھے۔ کسی کو بھی نہ آئے۔ روفی اُٹھ کر بولے۔ "دو مرتبہ بیس قدمی۔" انہوں نے وضاحت چاہی۔ روفی بولے۔ "جناب! چہل کے معنی ہیں چالیس اور چالیس قدمی سے دو مرتبہ قدمی کہیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے کیونکہ ٹہلتے ہوئے انسان آگے جاتا ہے اور پھر واپس آتا ہے۔"

جغرافیہ کے ماسٹر صاحب نے ایک دن روفی سے پوچھا۔ ’’اگر تم مشرق کی طرف مُنہ کر کے دونوں ہاتھ پھیلا دو تو تمہارے بائیں ہاتھ پر کیا ہو گا؟‘‘

روفی نے بڑی مسمّی شکل بنا کر کہا۔ ’’انگلیاں۔‘‘

حساب میں تو بالکل پھسڈی تھے۔ سوال پوچھا جا رہا ہے روپوں کے متعلق اور جواب نکلتا ہے مہینوں میں۔ اسی طرح مہینوں کا جواب سیروں چھٹانکوں میں نکل رہا ہے۔ حساب کے ماسٹر ڈانٹتے تو روفی کہتے۔ ’’جناب میں کیا کروں؟ یہ کم بخت جواب اسی طرح آیا ہے۔‘‘ اور جب مزدوری اور وقت کے سوال نکالتے تو جواب آتا ۳-۵/۳ لڑکے یا ۶۷-۵۳/۱۹ عورتیں۔ اس پر ماسٹر صاحب بہت خفا ہوتے۔ ایک روز روفی نے جواب نکالا ۳/۲ عورت۔ ماسٹر صاحب چنگھاڑ کر بولے۔ ’’نالائق ۳/۲ عورت بھی کبھی دیکھی ہے آج تک؟‘‘ یہ سر کھجا کر بولے۔ ’’جناب! کوئی لڑکی ہو گی۔‘‘

لیکن جب ہماری جماعت میں انسپکٹر صاحب معائنہ کرنے آئے تو وہ روفی سے بہت خوش ہوئے اور انعام دے کر گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ’’اگر پانی کو ٹھنڈا کیا جائے تو کیا بن جائے گا؟‘‘ ہم نے سوچا کہ روفی کہہ دیں گے کہ برف بن جائے گا۔ روفی نے پوچھا۔ ’’کتنا ٹھنڈا کیا جائے؟‘‘

وہ بولے۔ ”بہت ٹھنڈا کیا جائے۔“

روفی سوچ کر بولے۔ ”تو وہ بہت ٹھنڈا ہو جائے گا۔“ (بہت پر زور دے کر)

”اگر اور بھی ٹھنڈا کیا جائے؟“

”تو پھر یہ اور بھی ٹھنڈا ہو جائے گا“ روفی بولے۔

”اور اگر اسے بے حد ٹھنڈا کیا جائے؟“

”تو وہ بے حد ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

انسپکٹر صاحب مُسکرانے لگے اور پوچھا۔ ”اچھا اگر پانی کو گرم کیا جائے تب؟“

”تب وہ گرم ہو جائے گا۔“

”نہیں اگر ہم اسے بہت گرم کریں اور دیر تک گرم کرتے رہیں پھر؟“

روفی کچھ دیر سوچتے رہے، یکایک اچھل کر بولے۔ ”پھر چاء بن جائے گی۔“ اور انسپکٹر صاحب نے ایک عظیم الشّان قہقہہ لگایا۔ ماسٹر صاحبان نے کوشش کی کہ انہیں کہیں اِدھر اُدھر لے جائیں، لیکن وہ وہیں کھڑے رہے اور روفی سے بولے۔ ”بلّی کی کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں؟“

"تقریباً چار!"

"اور آنکھیں؟"

"کم از کم دو۔"

"اور دُمیں؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک"

"اور کان؟" انہوں نے پوچھا۔

"تو کیا سچ مچ آپ نے اب تک بلّی نہیں دیکھی؟" روفی مُنہ بنا کر بولے اور انسپکٹر صاحب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

ان دنوں سے میں اور روفی دوست تھے۔

میں جج صاحب کے ہاں رہتا تھا۔ پہلے ہمارا کُنبہ بھی وہیں تھا پھر ابّا کا تبادلہ ہو گیا اور وہ ایسی جگہ تبدیل ہو کر گئے جہاں کالج تو ایک طرف کوئی سکول تک نہ تھا۔ جج صاحب نے ہوسٹل نہ جانے دیا چنانچہ میں ان کے ہاں رہنے لگا۔ روفی بھی وہیں رہتے تھے اور جج صاحب سے ان کا کوئی دور دراز کا رشتہ تھا۔ غالباً وہ جج صاحب

کے بھتیجے تھے۔ جہاں کُنبے کے تمام افراد مجھے اچھے لگتے تھے وہاں ایک ہستی تو بہت عزیز تھی۔ وہ تھی رضیہ۔۔۔۔۔ اور جن سے میں ڈرتا تھا وہ تھیں رضیہ کی بڑی بہن جن کا اصلی نام تو اچھا بھلا سا تھا لیکن سب بچّے انہیں حکومت آپا کہتے تھے۔ میری ہی عمر کی ہوں گی یا شاید کچھ بڑی ہوں گی۔ اگر وہ وہاں نہ ہوتیں تو میں اور رضیہ کبھی کے بڑے گہرے دوست بن گئے ہوتے، لیکن ان کو میں ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

سارا دن کالج میں گزرتا۔ شام کو کھیلنے چلا جاتا اور رات کو سینما۔ رضیہ سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہ ملتا۔ ہفتے بھر میں ایک آدھ مرتبہ موقع ملتا اور وہی حکومت آپا کی نذر ہو جاتا۔ بنتی تو ان کی کسی سے بھی نہ تھی البتہ مجھ سے اور روفی سے خاص لگاوٹ تھی۔ میں تو چپ ہو جاتا، لیکن روفی ایسا جواب دیتے کہ حکومت آپا کھسیانی ہو کر رہ جاتیں۔

سارا دن لڑتی جھگڑتیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ تنقید کرتی رہتیں۔ کسی بات کا شہر میں ڈھنڈورا پٹوانا ہو تو جا کر حکومت آپا کو بتا دو، فوراً ہر ایک کو پتا چل جائے گا۔

میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ آخر ان کی پالیسی کیا ہے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ روفی کی رائے یہ تھی کہ یہ اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہیں اور دوسروں کا بھی اور مجھے یہ رائے حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی تھی۔

ادھر میں اور روفی نہایت عزیز دوست تھے۔ میں ان سے کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ یہاں تک کہ رضیہ کے متعلق بھی سب کچھ انہیں بتا رکھا تھا اور جو جو باتیں رضیہ اور میں آپس میں کرتے وہ میں روفی سے فوراً کہہ دیا اور ہمیشہ ان کے مشوروں پر عمل کرتا۔ وہ بڑے خلوص سے مجھے بتاتے کہ آج رضیہ سے یہ کہنا، آج یہ پوچھ کر دیکھنا، آج یہ کرنا، آج وہ کرنا۔ اور میں اسی طرح کرتا۔

غرضیکہ وہ میرے بے حد عزیز دوست تھے۔

ہمیں ایک صاحب نے سہ پہر کو پکچر پر مدعو کیا۔ چند ماہ پہلے ان سے واقفیت ہوئی تھی وہ بھی کس طرح؟ وہ ایک دن اپنے ابّا کے ساتھ جج صاحب سے ملنے آئے۔ وہاں میں اور روفی بیٹھے تھے۔ ان کے ابّا روفی کی باتوں سے پھڑک اٹھے اور پوچھا۔ ”کیوں برخوردار آج کل کیا کرتے ہو؟“

یہ بولے۔ "جی آج کل بی اے کا امتحان دیا کرتا ہوں۔" اور حقیقت یہی تھی۔ روفی نہ جانے کتنے سال سے بی اے کا امتحان دے رہے تھے۔

پھر وہ بزرگ جج صاحب سے بولے۔ "کیا بتاؤں کتنا جی چاہتا ہے کہ آپ کو فون کروں لیکن ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ آج کل تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ پہلے پہل یادداشت کے طور پر ایک نوٹ بُک میں ایسی باتیں لکھ لیا کرتا تھا، لیکن اب وہ نوٹ بُک ہی کہیں بھول جاتا ہوں۔"

روفی نے کہا۔ "جی فون کا نمبر یاد کرنے کے طریقے میں نے ایک کتاب میں پڑھے ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کروں؟"

وہ بولے۔ "ضرور!"

روفی نے بتایا۔ "وہاں لکھا تھا کہ اوّل تو فقط ایسے حضرات سے راہ و رسم بڑھانی چاہیے، جن کے فون نمبر بالکل آسان ہوں۔ مثلاً پانچ ہزار دو ہزار یا چار سو بیس۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو نمبر کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔ مثلاً ۶۴۵ کو یاد کرنا نہایت آسان ہے۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس میں پچپن جمع کر دیئے تو سات سو بن جائیں گے، اور اگر سات سو میں تین سو اور جمع کر دیئے جائیں تو ہزار بن جائیں گے۔

اسی طرح اگر ۶۴۵ کو ۶۴۵ سے ضرب دیا جائے تو فقط ۴۱۶۰۲۵ بن جائے گا۔ اور اگر ہم یاد رکھیں کہ ۶۴۵ محض چھ روپے چار آنے اور پانچ پائی ہے تو اسے کبھی نہیں بھول سکتے۔"

وہ بزرگ بڑے غور سے سُن رہے تھے۔

روفی بولے۔ "اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر یہی بہتر ہو گا کہ تاریخ کی کتاب کھول لی جائے اور اس نمبر کا سن تلاش کیا جائے۔ مثلاً ۶۴۵ میں سے اگر چھ کا ہندسہ ہٹا دیں تو ۴۵ رہ جاتا ہے اور ۴۵ قبل از مسیح میں سیزر کو ہمیشہ کے لیے ڈکٹیٹر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اُدھر اگر اس میں ایک ہزار جمع کر دیں تو ۱۶۴۵ء عیسوی میں نیزبی کی لڑائی ہوئی تھی۔"

اس دن سے یہ بزرگ اور ان کے صاحبزادے ہمارے دوست بن گئے۔

پکچر میں دیر تھی۔ میں روفی کے کمرے میں گیا، دیکھا کہ بیٹھے حامد کو پڑھا رہے ہیں۔۔۔ بولے بیگم کہہ گئی ہیں کہ اسے پڑھانا۔ میں بھی پاس بیٹھ گیا۔

روفی نے سوال کیا۔ "کیوں ننھے دنیا میں کل کتنے اُونٹ ہوں گے؟" وہ چُپ رہا۔

"اچھا! کیا رومن لوگ گاجریں کھاتے تھے؟"

”پتا نہیں!“

”ایک سال میں کتنے انچ ہوتے ہیں؟“

ننھے نے حساب لگا کر کچھ عجیب الٹا سیدھا سا جواب نکال دیا۔

اب روفی خفگی سے بولے۔ ”کیا تمہیں سچ مچ پتا نہیں کہ رومن گاجریں کھاتے تھے یا نہیں؟“

”جی نہیں!“ ننھا ڈر کر بولا۔

”اور یہ بھی پتا نہیں کہ دنیا میں اُونٹ کتنے ہیں؟“

”جی نہیں!“

”جہالت کی انتہا ہے! کیا تمہیں سچ مچ علم نہیں؟“ روفی چنگھاڑے۔

”جی نہیں“ ننھا سہم گیا۔

”مجھے خود پتا نہیں۔“ روفی بولے اور ننھے کو چھٹی مل گئی۔

اتنے میں روفی کے نام ایک خط آیا، جسے پڑھ کر انہوں نے بہت برا مُنہ بنایا ناک بھوں چڑھائی۔ کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ پھر بولے۔ ”کُچھ اور بھی سُنا؟ چھوٹے بھائی صاحب نے مونچھیں رکھ لی ہیں۔ کس قدر منع کیا تھا اسے؟ یہی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی اُگا لی ہے۔“ فوراً نوکر کو بلایا اور ایک تار لکھ کر دیا کہ بھیج دے۔ میں نے تار کی عبارت پڑھی۔ لکھا تھا Shave at Once وہ تار اسی وقت بھیج دیا گیا۔

ہم پکچر کے لیے تیار تو ہو گئے لیکن ہمارے نئے دوست نہیں پہنچے تھے۔ روفی نے فون کرنا چاہا، لیکن نمبر نہ ملا۔ آخر چڑ کر بولے۔ ”تو کسی اور کو فون کر دیں؟“

”کسی اور کو؟“

”ہاں! کیا حرج ہے؟۔۔۔کیے دیتے ہیں۔“ انہوں نے نہ جانے کون سے نمبر کو بلالیا میں رُک کر ریسیور کے نزدیک ہو گیا۔

”کون صاحب بول رہے ہیں؟“ روفی نے پوچھا۔

”خاکسار کو عبدالمجید مجبور کہتے ہیں۔“

"اوہ! عبدالمجید تربوز؟۔۔۔ تو گویا آپ شاعر بھی ہیں؟" حالانکہ انہوں نے صاف مجبور کہا تھا۔

"جی نہیں، مجبور!" وہ بولے۔

"معاف کیجئے، میں تو ایسی بے ادبی نہیں کر سکتا۔ آپ کسی قدر کسرِ نفسی کر رہے ہیں؟یعنی عبدالمجید لنگور"

"اُفّوہ!۔۔۔۔۔ مجبور۔۔۔۔۔۔۔۔مج۔۔۔۔۔بُور!" وہ بولے۔

"اچھا! مجبور صاحب ہیں۔ آپ کُل کتنے بھائی ہیں؟"

"چار ہیں ہم" وہ بولے۔

"اگر آپ پانچ ہوتے تو ہمارا کیا بگاڑ لیتے۔" روفی بولے اور جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

اتنے میں وہ صاحب آ گئے اور ہم سینما روانہ ہوئے۔ "پوچھا پکچر کون سی ہے؟" بولے "انصاف کی توپ" میں نے صدائے احتجاج بلند کی کہ کرکٹ وغیرہ جیسی دلچسپ چیزیں چھوڑ کر اس قسم کی پکچر دیکھنا سراسر بدمذاقی ہے لیکن روفی نے

کہا۔ ”چلو اب تیار ہو گئے ہیں تو فلم کا نام خواہ مخواہ مفلس عاشق یا خونخوار بھیڑیا ہی کیوں نہ ہو ضرور دیکھیں گے۔“

راستے میں ان صاحب نے اپنے والدِ بزرگوار کے متعلق جو باتیں شروع کی ہیں تو ہم تنگ آ گئے۔ ان کی تعریفیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ان کے والد منصف تھے اور اچھے خاصے بھاری بھر کم انسان تھے۔ یہ ان کی بڑائیاں کر رہے تھے کہ کس طرح انہوں نے خطرناک عادی مجرموں کو بَری کرا دیا اور بظاہر اچھے بھلے معصوم لوگوں کو قید خانے میں بھیج دیا تھا (سکور تو برابر ہی رہا) اب سارے ملک میں ان کے حیرت انگیز انصاف کا ڈنکا بج رہا تھا۔

آخر تنگ آ کر روفی بولے۔ ”تو وہ بہت اچھا انصاف کرتے ہیں؟“

”یقیناً!“ جواب ملا۔

”یعنی نہایت ہی بلند پائے کا انصاف کرتے ہیں وہ؟“

”پھر تو وہ انصاف کی توپ ہوئے۔“

کئی مرتبہ جی چاہا کہ حکومت آپا سے پوچھوں کہ آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ ہم کیا کریں جو آپ کے اس عجیب وغریب عتاب سے بچ سکیں جو ہر وقت ہم پر نازل ہوتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہاتھ دھو کر (بلکہ ہاتھ مُنہ دھو کر) میرے پیچھے پڑی رہتی تھیں۔ رضیہ کی طرف میں نے ذرا آنکھ اٹھائی اور آفت آگئی۔

اس میں میرا کیا قصور تھا؟ گھر میں ایک اچھی لڑکی ہے جو اتنی پیاری لگتی ہے تو اسے کیوں نہ دیکھیں۔ اگر یہی ہے تو حکومت آپا رضیہ کو کسی صندوق میں مقفّل کیوں نہیں کر دیتیں تاکہ کوئی نہ دیکھ سکے۔ جب دیکھو تنقید کر رہی ہیں۔ جس پر پہلے پہل تو میں اداس ہو جایا کرتا لیکن بعد میں عادی ہو گیا۔ اور یہ تنقید کیسی ہوتی؟ شوقین لڑکا ہے۔ رنگین مزاج ہے۔ رنگ برنگے کپڑے پہنتا ہے۔ خوشبو کیوں لگاتا ہے۔ اس کا سینہ کافی چوڑا ہے، لیکن چہرہ کچھ دُبلا ہے۔ اس کا کوئی اعتبار نہیں (نہ کیجئے اعتبار کس مسخرے نے التجا کی ہے آپ سے) ہر وقت بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولتا رہتا ہے۔ (مضبوط پٹھّے ہیں کیوں نہ ٹٹولیں) بیزاری کو بزاری کہتا ہے (یہ آپ کے کانوں کا قصور ہے) ہر وقت اکڑ کر چلتا ہے (تو کیا کُبڑا ہو کر چلا کروں؟) رضیہ کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ اسے گھورا رہتا ہے اور اس کی باتیں

کرتا ہے (رضیہ اچھی جو لگتی ہے) مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا (مجھے بھی آپ ذرا اچھی نہیں لگتیں)

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔" حکومت آپا کا تکیہ کلام تھا (لفظ "پہلے" پر خوب زور دے کر) ایک دن میں لائبریری سے مشہور ملکہ رضیہ سلطانہ پر تاریخی کتاب لے کر آیا۔ حکومت آپا نے دیکھ لی، بولیں۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا۔" ایک دن ایک ڈرامے میں لگاتار دو گھنٹے رضیہ کو دیکھتا رہا اور اپنا پارٹ غلط سلط کر گیا۔ حکومت آپا دیکھ کر چلائیں "مجھے پہلے ہی پتا تھا" اور روفی بولے۔ "جب آپ کو ہمیشہ پہلے ہی سے پتا ہوتا ہے تو آپ ہمیں پہلے سے ٹوک کیوں نہیں دیتیں۔"

روفی اکثر انہیں آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ ایک روز بیگم کا کوئی قیمتی زیور کھو گیا۔ ہم سب ڈھونڈ رہے تھے۔ یکایک روفی بولے۔ "حکومت آپا تمھیں تو پتا ہی ہو گا کہ زیور کہاں ہے۔"

"مُجھے کیا پتا؟" وہ بولیں۔

"تمھیں پہلے ہی سے پتا ہوا کرتا ہے۔"

پھر ایک دن سب پریشان بیٹھے تھے۔ کوئی کہتا حامد پاس ہو گیا کوئی کہتا تھا بالکل فیل ہو گیا۔ ٹیلیفون کیا، کوئی جواب نہ آیا۔ جج صاحب بھی پورا زور لگا چکے تھے۔ آخر روفی کہنے لگے۔ "لو حکومت اب بتا ہی دو۔" سب حکومت آپا کے پیچھے پڑ گئے کہ بتاؤ کون سی خبر صحیح ہے۔ روفی بولے۔ "خواتین و حضرات! ایسے موقعوں پر آپ ہمیشہ حکومت سے مشورہ لیا کیجئے۔ یہ ولی اللہ ہیں اور انہیں ہر چیز کا پہلے سے پتا ہوتا ہے۔"

اس کے باوجود حکومت آپا کا تکیہ کلام اسی طرح رہا۔ روفی مجھے رضیہ کے متعلق طرح طرح کے مشورے تو دیا کرتے لیکن ہمیشہ پریشان رکھتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ سوال پوچھتے کہ آخر میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں رضیہ کو اچھا لگتا ہوں؟ یقیناً کوئی ثبوت نہ تھا۔ اس لیے یہ فقط یک طرفہ کاروائی قرار دی جاتی۔ یعنی کسی کو پسند کرنے سے کچھ نہیں بنتا جب تک کہ وہ بھی جواباً پسند نہ کرے۔ لہٰذا ان کے فارمولے کے مطابق میں اور رضیہ بالکل اجنبی تھے۔

وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ "دنیا بہت بڑی ہے، کہیں اور جا کے کوشش کرو۔ رضیہ سے بھی بہتر لڑکیاں ملیں گی۔" اور مجھے ان کا یہ مشورہ بالکل پسند نہ آتا۔

ایک روز کہنے لگے۔ ”رضیہ کی نظر کمزور ہے، اسے دُور کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی ہیں۔“

”تمہیں کیا پتا؟“

”عید کا چاند اسے نظر نہ آ سکا۔ چنانچہ اس نے جج صاحب کی عینک سے دیکھا تھا۔“

”تو پھر؟“

”پھر کیا؟ شادی تک تو وہ کیا عینک لگائے گی، البتہ شادی کے بعد فوراً بعد لگا لے گی۔“

اسی شام کو روفی اور حکومت آپا کی بحث ہو گئی۔ موضوع تھا۔۔۔۔ عینک۔۔۔۔ نہ جانے کون عینک کے خلاف بول رہا تھا اور کون طرفدار تھا۔ غدر سا مچا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر باہر سے سُنتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔

روفی کہہ رہے تھے۔ ”تو گویا خاکسار جیت ہی گیا۔“

حکومت آپا بولیں۔ ”تعجّب ہے کہ تین گھنٹے کی بحث کے بعد بھی آپ قائل نہیں ہوئے۔“

”تین گھنٹے کی بحث کے بعد؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی تین گھنٹے تک بحث ہوئی۔ پونے تین گھنٹے حکومت بولیں دس منٹ وقفہ رہا اور پانچ منٹ میں بولا۔“

اور وہ جل ہی تو گئیں، کیونکہ وہ بولتی بہت تھیں۔

اتنے میں ٹن ٹن کرتا ہوا آگ بجھانے کا انجن سڑک سے گزرا۔

حکومت آپا بولیں۔ ”کہیں آگ لگی ہے تو شاید اس طرف!“

اتنے میں دوسرا انجن دوسری جانب ٹن ٹن کرتا ہوا چلا گیا۔ حکومت آپا بولیں۔ ”اوہ! اِدھر بھی آگ لگی ہے۔“

روفی سر مٹکا کر بولے۔ ”دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔“ اور وہ ناراض ہو کر چلی گئیں۔

روفی خوش ہو کر بولے۔ "امرود کھائے جائیں؟" میں نے سر ہلا دیا۔ کہنے لگے۔ "کوئی نوکر آئے تو اسے باغ میں بھیجتے ہیں۔" اتنے میں جُمّن (دیو) گزرا۔ یہ جُمّن صاحب ایک نہایت ہی موٹے نوکر تھے، جنہیں بچّے رات کو دیکھ کر ڈر جاتے۔ اس لیے ان کی ڈیوٹی دن کو لگا رکھی تھی۔ رات کو ان کی چھٹی ہوتی۔

روفی نے آواز دی۔ "جُمّن؟" اس نے سُنا ہی نہیں۔ روفی نے پھر آواز دی۔ اس نے پھر نہیں سُنا۔ روفی بولے "انگوٹھی گھسیں اس کے لیے؟" میں نہ سمجھ سکا۔

روفی نے سمجھایا۔ "بھئی دیو ہے، ایسے ویسے تھوڑا ہی آ جائے گا۔ کم از کم انگوٹھی تو گھسنی پڑے گی۔"

ذرا سی دیر میں جُمّن پھر گزرا۔ ہم نے بلایا، وہ آ گیا۔ روفی بولے۔ "ہم نے انگوٹھی گھسی تھی۔ تم آئے ہی نہیں۔" ویسے وہ بڑا خوش مزاج تھا، لیکن اس وقت نہایت اداس دکھائی دے رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے گھر سے تار آیا ہے۔ اسے فوراً بلایا گیا ہے۔

"گھر سے اوّل تو میں خود واپس آ جاؤں گا، ورنہ آپ بلا لیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور بُلا لیں گے۔" میں نے یقین دلایا۔

”بھلا آپ کس پتے پر اطلاع دیں گے؟ کیونکہ میں نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھروں گا۔“

روفی بولے۔”اس کا تو یہی علاج ہے کہ تم اپنی مونچھ کا ایک بال ہمیں دے جاؤ۔ تا کہ جب ہم تمھیں بُلانا چاہیں تو بال کو دھوپ میں رکھ دیں گے۔ پہلے آندھی آئے گی۔ پھر مینہ اور بعد میں تم اُڑتے آجاؤ گے۔“

وہ کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ میں نے لا حول پڑھی۔

جُمّن گیا تو دیکھا کہ روفی بھی کمرے میں نہیں تھے۔ دوسرے روز پھر اسی طرح کا واقعہ ہوا۔ مجھے کچھ شُبہ سا ہو گیا۔ میں نے رضیہ کو بتایا اور ایک پروگرام بنایا گیا۔ سہ پہر کو چائے پر رضیہ نے جان بوجھ کر لا حول پڑھ دی اور بجلی کی طرح روفی کمرے سے نکل گئے حالانکہ ابھی چاء شروع بھی نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا میں نے سب کو بتا دیا کہ ”چونکہ روفی لا حول سے بھاگتے ہیں اور ان کا حلیہ بھی شیطان سے ملتا ہے اس لیے آج سے وہ مکمل شیطان ہیں۔ آئندہ کوئی انہیں روفی نہ کہے، شیطان کہے۔ یعنی اگر سامنے ہمّت نہ پڑے تو کم از کم پیٹھ پیچھے ہی کہہ دے۔“

بس اس دن روفی با قاعدہ طور پر شیطان قرار دیئے گئے۔

نہایت دلفریب چاندنی رات تھی، پورا چاند درختوں کے جھنڈ سے طلوع ہوا تھا۔ ہوا کے خنک جھونکوں سے پودے جھوم رہے تھے۔ میں فوّارے کے پاس بیٹھا تھا۔ خیالات کے سلسلے کو جہاں کہیں سے بھی شروع کرتا تھا ختم رضیہ پر ہوتا تھا۔ یکایک جو دیکھتا ہوں تو پرے رضیہ پلاٹ میں بیٹھی چاند کو تک رہی تھی۔

ان دنوں اکثر میں اسے تنہا گوشوں میں خاموش بیٹھے دیکھا کرتا تھا۔ آخر کس کے متعلق سوچا کرتی ہے؟ میں بے چین ہو گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور پہنچا سیدھا شیطان کے کمرے میں۔ وہ سو رہے تھے، انہیں زبردستی جگایا۔

''ارے!'' میرے مُنہ سے نکل گیا۔ ''تم عینک لگا کر سوتے ہو؟''

''کل عینک لگانی بھول گیا تھا، رات بھر خواب دُھندلے نظر آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم خواب صاف دکھائی دیں۔''

میں اتنا بے چین تھا کہ مجھ سے ہنسا بھی نہ گیا۔ جلدی سے سب کچھ انہیں بتا دیا اور کہا۔۔۔ ''رضیہ کو کسی کا خیال ضرور ہے، لیکن یہ پتا نہیں کہ وہ خوش قسمت ہے کون؟ ویسے وہ آج کل ہر وقت کسی کے متعلق سوچتی ضرور رہتی ہے۔''

دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ سوال یہ تھا کہ کیسے یہ گتھی سلجھائی جائے؟ ویسے میں یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اسے میرا کس قدر خیال ہے۔

آخر بڑی سوچ بچار کے بعد شیطان بولے۔ ”بھئی اس کے لیے تو تھوڑی سی جرأت کرنی پڑے گی۔“

”وہ کیا؟“

”اگر میری مانو تو تم خود کُشی کر لو“

”خود کُشی کر لوں؟“ میں چونک پڑا۔

”اصلی نہیں، نقلی خود کُشی۔ ظاہر نہیں کریں گے کہ تم سچ مچ خود کُش ہو گئے ہو۔ پھر دیکھیں رضیہ کیا کرتی ہے؟“

میں نے صاف انکار کر دیا۔ بیگم کو ضرور پتا چل جائے گا اور اگر انہوں نے امّی کو لکھ دیا تو آفت آ جائے گی۔ ویسے خود کُشی کرنا ہے بھی فضول سی حرکت۔

شیطان بولے۔ "بیگم کو تو ہرگز پتا نہیں چلنے دیں گے۔ اس اتوار کو سارا کُنبہ ایک پارٹی پر جا رہا ہے۔ رضیہ کا امتحان اگلے ہفتے ہے اس لیے وہ یہیں رہے گی۔ بس میدان صاف پا کر تم خود کُشی کر لینا۔ سارا انتظام میں کر دوں گا۔"

ایک طویل بحث کے بعد شیطان نے مجھے ورغلا لیا۔ اگلے روز ہم نے خوب ریہرسل کیے۔

اتوار کا دن آیا۔ رضیہ کے سوا سب پارٹی پر چلے گئے۔ مجھے اور شیطان کو بہتیرا مجبور کیا گیا لیکن ہم نے ایک کرکٹ میچ کا بہانہ کر دیا۔

شیطان کی ہدایات کے مطابق تیاریاں کی گئیں اور پھر میں نے خود کشی کر لی۔ ایک صوفے پر لیٹ گیا ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا ہے اور فرش پر تین انگلیوں کے نیچے ایک خالی شیشی پڑی تھی۔ جس پر "زہر" لکھا تھا۔ شیطان نے میری طرف دیکھا اور پوچھا "تیّار؟" میں نے کہا۔ "ہاں" اور انہوں نے ایک عجیب بے ڈھنگی آواز میں شور مچانا شروع کر دیا جس پر مجھے ہنسی آ گئی۔ رضیہ بھاگی بھاگی آئی۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کر لیں، لیکن پلکوں میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ شیطان نے فوراً اسے بتایا کہ میں نے خود کُشی کر لی ہے۔ رضیہ نے پہلے شیشی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا پھر میری نبض دیکھی۔ بھلا میں نبض کس طرح بند کر سکتا تھا۔ بولی اُفوّہ!

ابھی تھوڑی سی جان باقی ہے۔ گھبرائی ہوئی ساتھ کے کمرے میں گئی۔ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کر رہی تھی۔ انہیں فوراً آنے کے لیے کہا اور بولی۔ "خدا کے لیے جلدی کیجئے، زندگی اور موت کا سوال ہے۔" اور میرا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے؟ میری زندگی کا یا رضیہ کی زندگی کا؟ میں نے شیطان کو اشارہ کیا وہ مُسکرائے۔ رضیہ گھبرائی ہوئی آئی اور میرا سر دبانے لگی۔ اب جو اس کی انگلیاں گردن تک پہنچی ہیں تو مجھے سخت گُدگُدی ہوئی۔ بے حد ضبط کیا۔ آخر کھِلکھِلا کر ہنس پڑا اور جلدی سے بیٹھ گیا۔

"ہیں؟" رضیہ کے مُنہ سے نکلا۔

"ہیں؟" شیطان نے چنگھاڑ کر کہا۔

"دیکھا ڈرا دیا نا تمہیں؟" میں بولا۔

"واقعی میں تو ڈر ہی گئی تھی۔" اس نے کہا اور خوشی کے مارے میرا برا حال ہو گیا۔

تو کیا رضیہ کو میرا بہت خیال تھا۔ اس نے خود جو کہا تھا کہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔

"تو کیا تم سچ مچ بہت گھبرا گئی تھیں؟" میں نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔

"ہاں کچھ گھبرا ہی گئی تھی۔" وہ مُسکرا رہی تھی۔

"کچھ کیا؟۔۔۔۔یوں کہو کہ مکمل طور پر گھبرا گئی تھی، بہت بُری طرح گھبرا گئی تھیں۔"

"خیر! اتنی تو نہیں گھبرائی۔ دراصل خودکُشی اچھی طرح نہیں کی گئی۔ اس میں کچھ خامیاں وہ گئیں۔"

"اب تم خواہ مخواہ کچھ بھی کہو۔ ایک مرتبہ تو نہایت پریشان ہو گئی تھیں۔"

"مثلاً اس زہر کی شیشی کو لیجئے۔" وہ بولی۔ "مانا کہ اس میں کبھی ٹنکچر آیوڈین آئی تھی۔ لیکن پورے دو سال سے اس میں بادام روغن تھا اور اگر واقعی بادام روغن سے خودکشی ہو سکتی ہے، تب بھی یہ عرصے سے خالی پڑی تھی۔"

"لیکن تم نے فون تو بڑی گھبراہٹ میں کیا تھا۔" میں کھسیانا ہو چلا تھا۔

"اچھا بتائیے فون کس کمرے میں ہے؟"

"ڈرائنگ روم میں!" میں نے کہا۔

"اور میں نے فون کس کمرے سے کیا تھا؟۔۔۔ ساتھ کے کمرے سے نا؟"

"ہاں!"

"اور ساتھ کا کمرہ ہے گودام۔ اب بتائیے وہاں ٹیلیفون کہاں سے آ گیا؟۔"۔۔۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں رضیہ کو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ بلکہ شاید بُرا ہی لگتا ہوں۔

اگلے روز ہم سب ایک کلاسیکل رقص کے ماہر کا ناچ دیکھنے گئے۔ بڑا مشہور رقاص تھا۔ بے شمار لوگ آئے تھے۔ شروع میں کچھ گانا بجانا ہوا۔ پھر اس کا ناچ شروع ہوا۔ آرکسٹرا بجنے لگا۔ پہلے تو دیر تک وہ چُپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے یکلخت ہوا میں ایک چھلانگ لگائی اور عجیب سی حرکتیں شروع کر دیں۔

ننھی حیران رہ گئی۔ "بھیّا! یہ پتھر کا بُت اب تو خوب ہِل رہا ہے۔"

اب جو اس اللہ کے بندے نے ہاتھ پیر مارنے شروع کیے ہیں تو ننھی بالکل گھبرا گئی۔۔۔۔۔ "بھیّا! یہ آدمی کیا کر رہا ہے؟"

حکومت آپا بولیں۔ "ناچ رہا ہے۔"

ننھی نے پوچھا۔ "اس طرح ناچا کرتے ہیں کیا؟"

حکومت آپا بولیں۔ "چپ چاپ دیکھتی رہو، اسے کلاسیکل ناچ کہتے ہیں۔"

ننھی مچل گئی۔ "نہیں تو! یہ آدمی تو کچھ اور تماشا کر رہا ہے۔"

شیطان بولے۔ "ننھی! بات دراصل یہ ہے کہ اس نے علی الصبح فروٹ سالٹ پیا تھا اور اب اشتہاروں کے مطابق اسے فرحت بخش فروش سالٹ فیلنگ ہو رہی ہے۔"

شیطان نے سُرخ چھینٹ کا انگرکھا پہن رکھا تھا۔ سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ انٹرول ہوا تو میں اور شیطان باہر آ گئے۔ چھینٹ کا انگرکھا واقعی عجیب سی چیز تھی۔ جو دیکھتا تھا، ٹھہر جاتا تھا۔ چند حضرات نے تو سچ مچ ہنسنا شروع کر دیا۔ شیطان رُک گئے اور پیچھے مُڑ کر بولے۔ "حضرات آپ کی ہنسی سر آنکھوں پر۔ لیکن آپ براہِ کرم جلدی سے ہنس لیجئے، کیونکہ مجھے ایک ضروری کام پر جانا ہے اور بغیر آپ کے شوق کی تکمیل کے میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔" وہ کچھ شرما سے گئے۔

"تو آپ ہنس چکے کیا؟" شیطان نے پوچھا۔ "وہ چپ رہے۔"

"کیا بندہ جا سکتا ہے؟" ان میں سے ایک نے سر ہلا دیا۔

ہم جب واپس آئے تو ابھی اچھا خاصا دن باقی تھا۔ باغ سے گزرتے ہوئے شیطان رُک گئے، مالی کو بلایا اور مٹّی کا ایک ڈھیر دِکھا کر کہا۔ "یہ ڈھیر یہاں نہیں ہونا چاہیے۔"

"جناب یہ بغیر کئی مزدوروں کے باہر نہیں پھینکا جا سکتا۔"

"واہ معمولی سا کام ہے۔ ایک بڑا سا گڑھا کھود لو اور اس میں یہ مٹی دبا دو"

بات مالی کی سمجھ میں آ گئی اور وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر ہمارے پاس آیا اور بولا "جناب وہ مٹّی تو بھر دی گئی ہے، لیکن جو نئے گڑھے کی مٹّی ہے، اس کا کیا کیا جائے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ ایک اور گڑھا کھود کر اس میں دبا دو۔" شیطان نے کہا۔ مالی پھر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہانپتا ہوا آیا اور پوچھا۔ "وہ مٹّی تو دبا دی گئی، لیکن اب نئے گڑھے کی مٹّی؟ وہ کہاں کی جائے؟"

"ہمیں نہیں پتا" شیطان جھلّا کر بولے۔ "معمولی سی بات ہے ایک اور گڑھا کھود لو۔" اور مالی بیچارہ سر کھجاتا ہوا چلا گیا۔ اتنے میں جج صاحب تشریف لے آئے اور وہیں بیٹھ گئے۔ ہم کھیلوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔

"تمہیں کون سے کھیل پسند ہیں؟" جج صاحب نے پوچھا۔

"کبڈی اور پولو۔" شیطان نے جواب دیا۔

"کوئی خاص اچھے کھیل تو نہیں ہیں۔" وہ بولے۔

"آپ کو کون سا کھیل مرغوب ہے؟" شیطان نے پوچھا۔

"اسے کھیل تو نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے گھڑ دوڑ بہت پسند ہے۔ جب میں یورپ میں تھا تو نہایت شوق سے گھڑ دوڑ دیکھا کرتا تھا۔"

"معاف کیجئے مجھے گھڑ دوڑ بالکل پسند نہیں۔" شیطان بولے۔

"وہ کیوں؟"

"دیکھئے نا، یہ سب جانتے ہیں کہ کچھ گھوڑے کچھ گھوڑوں سے تیز دوڑتے ہیں اور یہ بھی لازمی امر ہے کہ اگر بہت سے گھوڑے دوڑیں گے تو کچھ آگے نکل جائیں

گے اور پھر پیچھے رہ جائیں گے اور آخر میں ایک گھوڑا سب سے آگے نکل جائے گا۔ بھلا یہ معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ کون سا گھوڑا آگے نکلتا ہے؟ یا تو یہ ہو کہ اپنا پالتو گھوڑا حصّہ لے رہا ہو، یا کسی گھوڑے سے واقفیت ہو تو اسے دیکھنے آدمی چلا بھی جائے۔ ورنہ سب گھوڑے ایک جیسے ہیں۔"

جج صاحب سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر مُسکرا کر بولے لاحول ولا قوۃ اور دفعتاً شیطان کمرے سے نکل گئے۔

مجھے اور شیطان کو ایک بہت بڑی دعوت پر بلایا گیا۔ بڑے مدبّر قسم کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ جج صاحب اور بیگم صاحبہ وہاں نہیں تھے۔ چنانچہ ہمیں پوری آزادی مل گئی اور شیطان اُتر آئے اُلٹی سیدھی حرکتوں پر۔ ایک خطرناک سے بزرگ ہماری طرف بہت بُری طرح دیکھ رہے تھے۔ کچھ مولانا سے معلوم ہوتے تھے۔ نہ جانے کیوں اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہے تھے۔ آخر جب ان سے رہا نہ گیا تو شیطان سے بولے۔ "صاحبزادے! میں دیکھ رہا ہوں کہ پورے آدھ گھنٹہ سے ان لڑکیوں کو گھور رہے ہو۔ یہ نہایت بُری بات ہے۔"

شیطان نے جواب دیا۔ ”قبلہ گھورنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ گھورنا بالتحقیق اور گھورنا بالتفریح۔۔۔۔۔۔ یہ خاکسار اس وقت اوّل الذّکر کر رہا ہے، کیونکہ مجھے ابھی کسی نے بتایا ہے کہ ان خاتون کی ناک ترچھی ہے اور ایک آنکھ بڑی ہے ایک چھوٹی۔“

مولانا ابھی کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ شیطان نے جلدی سے ٹوکا۔ ”اور آپ اُن کو کیوں نہیں منع کرتے ہو جو گھورنا بالتفریح کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ایسے یہاں بیشمار حضرات ہیں۔ مثال کے طور پر ان صاحب کو (اشارہ کر کے) ہی لیجئے جو زیرِ مونچھ مُسکرا رہے ہیں۔“

”زیرِ مونچھ مُسکرا رہے ہیں؟“

”لوگ زیرِ لب مُسکرایا کرتے ہیں، لیکن ان کی مونچھیں اس قدر گھنی اور خونخوار ہیں کہ ہم اس مُسکراہٹ کو محض زیرِ مونچھ مُسکراہٹ ہی کہہ سکتے ہیں۔ غالباً ان صاحب کا نعرہ یہ ہوگا کہ مونچھوں کے سائے میں ہم پل کر جوان ہوئے ہیں۔“

بات شروع کہاں سے ہوئی تھی اور کہاں جا پہنچی کہاں۔ مولانا کھسیانے ہو کر کہنے لگے۔ ”خیر کچھ بھی ہو ہر حال میں انسان کو پرہیز گار ہونا چاہیے۔“

"میں پرہیز گار ہوں۔" شیطان بولے۔

"تم اور پرہیز گار؟۔۔۔۔۔ نعوذ باللہ!"

"جی نہیں، الحمد للہ، مجھے فخر ہے کہ ماشاء اللہ میں پرہیز گار ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گا۔ پرہیز گار وہ شخص ہے جو گُڑ، کھٹائی، چکنی اور گرم چیزوں اور مرچ مسالے سے پرہیز کرے اور وہ میں کرتا ہوں۔"

اتنے میں چند مہمان آ گئے اور ہمارا تعارف ان سے کرایا گیا۔ وہ مولانا اِدھر اُدھر ہو گئے۔ جہاں چاروں طرف شور و غل مچا ہوا تھا۔ وہاں ایک صاحب کو دیکھا جو چپ چاپ بیٹھے تھے، جیسے مراقبے میں ہوں۔ شیطان نے ان سے باتیں شروع کر دیں۔

"جناب اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں؟"

"فرمایئے!"

"آپ چُپ کیوں ہیں؟"

"بس یونہی!"

"تو صاحب اگر آپ عقلمند ہیں تو بیوقوفی کر رہے ہیں اور اگر بیوقوف ہیں تو عقلمندی کر رہے ہیں۔" اور وہ صاحب سوچنے بیٹھ گئے کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟

اِدھر اُدھر ڈھونڈنے پر وہ مولانا ہمیں پھر مل گئے اور بدستور بڑے غیض و غضب سے ہمیں گھورنے لگے۔ شیطان چاہتے تھے کہ ان سے باتیں ہوں، لیکن کوئی بہانہ نہیں ملتا تھا۔ اتنے میں چند چھوٹے قد کی خواتین داخل ہوئیں، بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں۔ شیطان جلدی سے بولے۔ "دیکھیے قبلہ! یہ پینگوئن سیریز کی خواتین ہیں۔" اور انہوں نے نہایت خطرناک انداز سے ہوں کی۔ اسی وقت ایک نہایت ہی دبلے صاحب ایک بہت زیادہ موٹے صاحب کے ساتھ داخل ہوئے۔ دونوں میں اس قدر فرق تھا کہ ایک دوسرے کو بُری طرح نمایاں کر رہے تھے۔ شیطان بزرگ کے قریب رُک کر بولے۔ "وہ دیکھیے جناب ان میں سے ایک استعمال سے پہلے اور دوسرے استعمال کے بعد۔"

بزرگ شاید سمجھ نہ سکے۔

شیطان نے وضاحت کی۔ "آپ نے مقوّی دواؤں کے اشتہار تو دیکھے ہوں گے۔ وہاں استعمال سے پہلے اور استعمال کے بعد کی فوٹو بھی ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ بالکل وہی چیز آپ یہاں دیکھ لیجئے۔"

دروازہ کھلا اور ایک نہایت ہی چھوٹے قد کے حضرت اور ایک بہت ہی دبلے لمبے حضرت داخل ہوئے۔ ان کے قد میں کوئی چار پانچ فٹ کا فرق ہو گا۔

مولانا جھلّا کر بولے۔ ”ان پر تم نے کچھ نہیں کہا؟ کہ دو ان کے متعلق بھی۔۔۔۔۔۔“

شیطان بولے۔ ”اجی کیا خاک کہوں؟ سب دیکھ رہے ہیں کہ گلی ڈنڈا آرہا ہے۔“

اتنے میں کھانا شروع ہو گیا۔

ہم دونوں جان بوجھ کر مولانا کے قریب بیٹھے۔ شاید انہیں مچھلی بہت مرغوب تھی۔ چنانچہ کئی مرتبہ مچھلی منگوائی۔ اب جو وہ مچھلی منگواتے ہیں تو ملازم اِدھر اُدھر کی چیزیں تو دے جاتا، لیکن مچھلی نہ لاتا۔ صاف ظاہر تھا کہ ختم ہو گئی ہے۔ لیکن ان کا اصرار یہی تھا کہ مچھلی لاؤ۔ بیچارہ ملازم صاف جواب بھی نہیں دے سکتا تھا اور ہاں بھی کہہ جاتا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا اور نعرہ لگایا۔ ”یہ کمبخت مچھلی کیوں نہیں لاتا؟ اور اب تو غائب ہی ہو گیا ہے، نہ جانے کہاں؟“

”مچھلیاں پکڑنے گیا ہے۔“ شیطان بولے۔

باہر زور کی بارش شروع ہو چکی ہے، چنانچہ کھانے کے بعد یہ طے ہوا کہ بارش تھمنے کا انتظار کیا جائے اور اتنی دیر کافی کا دوسرا دور چلے۔ سب لوگ خاموش ہو گئے اور ایک بزرگ نے (جن کو ہر وقت ملول اور محزون باتیں کرنے پر فانی کہا جاتا تھا اور جو فوراً ہی صدر بنا دیئے گئے تھے) ایک صاحب سے کہا۔ ''جب تک بارش نہیں رکتی آپ بیتیاں بیان کی جائیں۔ پہلے آپ اپنی زندگی کا کوئی سچا غم ناک واقعہ سنایئے۔'' انہوں نے سُنا دیا۔ ساتواں نمبر شیطان کا آیا۔ چونکہ پہلے نہایت ہی دردناک کہانیاں سنائی گئی تھیں اس لیے لوگ سہمے بیٹھے تھے۔ شیطان نے شروع کیا۔ ''خواتین و حضرات! یہ واقعہ میری حیاتِ فانی میں سنگِ میل کا کام دیتا ہے۔ اس نے میری فانی زندگی پر سب سے لافانی اثر ڈالا'' اور سب چپ ہو کر بڑی توجّہ سے سُننے لگے۔

''یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب میں گتکا کھیلا کرتا تھا۔ آپ لوگوں میں سے جن کو یہ پتا ہے کہ گتکا ہوتا کیا ہے، انہیں معلوم ہو کہ میں اب بھی اپنے کالج کا بہترین گتکے باز ہوں، لیکن ان دنوں خوب مہارت تھی۔ ایک دن ہم سب کالج کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہم منتظر تھے کہ

کب بارش ختم ہو اور باہر نکلیں۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک جگنو اُڑا جا رہا ہے!"

"دن میں جگنو؟" انہی مولانا نے پوچھا۔

"جی ہاں، یا پھر جگنو کی قسم کا کوئی اور پرندہ ہو گا۔"

"جگنو پرندہ ہے کیا؟" مولانا نے پھر پوچھا۔

"جی قبلہ! جو چیز اُڑتی ہے، وہ پروں سے اڑتی ہے لہٰذا پرندہ ہے۔ ہاں تو سب لڑکوں کا جی للچایا کہ اسے پکڑیں مگر بارش کی وجہ سے کسی کی ہمّت نہ پڑی۔ آخر میں تیار ہوا۔ لڑکوں نے منع کیا کہ بھیگ جاؤ گے۔ میں نے ایک نہ سُنی اور باہر نکل آیا۔ گتکے کا ماہر تھا۔ ایک بوند آئی اسے گردن کی ایک جنبش سے بچا لیا۔ دوسری آئی اسے ایک طرف ہٹ کر بچایا۔ تیسری آئی اسے کمر کی حرکت سے بچایا۔ غرضیکہ اسی طرح بل کھاتا، طرح طرح کے پینترے بدلتا ہوا ایسی موسلا دھار بارش میں جگنو کو صاف پکڑ لایا۔ اور جب واپس برآمدے میں پہنچا تو میرے لباس پر ایک بوند بھی نہیں تھی۔"

اب جو قہقہے لگے ہیں تو فضا کی سنجیدگی یکلخت ختم ہوگئی۔ صدر صاحب نے اُٹھ کر فرمایا۔ ”روفی صاحب! ہم آپ سے ایک سنجیدہ واقعہ سُننا چاہتے ہیں اور آپ کو دس منٹ دیتے ہیں۔ اتنے میں رنجوری صاحب اپنی رنجیدہ داستان سنائیں گے۔“

اتفاق سے یہ وہی صاحب تھے جو اتنی دیر سے گُم سُم بیٹھے تھے۔ بیچارے گھبرا گئے سوچا کہ یہ کیا آفت آئی۔ بہتیرا پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہاں کون سُنتا تھا۔ آخر تنگ آکر بولے۔ ”مجھے اپنا کوئی واقعہ تو یاد نہیں فقط ایک لطیفہ ذہن میں آرہا ہے جو میں نے دوسری یا تیسری جماعت میں پڑھا تھا۔ وہ یہ کہ ایک جگہ بیوقوف بیٹھے تھے۔ ایک نے پوچھا کہ اگر دریا میں آگ لگ جائے تو مچھلیاں کدھر جائیں گے؟ دوسرا بولا درختوں پر چڑھ جائیں گی۔ تیسرے نے فوراً۔۔۔۔۔۔“

”اجی حضرت وہ تو تین تھے۔ یہ چوتھا بیوقوف آپ کہاں سے لے آئے؟“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”چوتھے یہ خود تھے۔“ شیطان بولے۔ اور لوگ چیخیں مار مار کر ہنسنے لگے۔ اب صدر صاحب نے شیطان سے درخواست کی کہ وہ ایک سنجیدہ واقعہ سنائیں۔

شیطان نے کہا۔ ”آج سے چند سال پہلے کا ذکر ہے یہی کمرہ تھا اور میں یہاں ذاکر صاحب (میزبان کے صاحبزادے) کے ساتھ آیا تھا۔ کوئی رات کے دس بجے تھے۔ بالکل ایسی ہی بارش ہو رہی تھی۔ میں گھر نہ جا سکا اور اسی کمرے میں سونا پڑا (اشارہ کر کے) میرا بستر یہیں بچھا ہوا تھا۔ میں لیٹ گیا، سگریٹ ختم ہو چکا تھا، میں نے اسے بے خبری کے عالم میں ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ نیچے قالین بچھا ہوا ہے، جلتا سگریٹ پھینکا تھا۔ جھانک کر جو دیکھتا ہوں تو پلنگ کے نیچے سے ایک سوکھا ہوا ہاتھ نکلا اور سگریٹ کو اٹھا کر پھر پلنگ کے نیچے غائب ہو گیا۔“سب کے سب ہم گئے۔

”اور خواتین و حضرات! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہاتھ کسی زندہ شخص کا نہیں تھا۔ بالکل سوکھا ہوا اور مریل ہاتھ تھا۔ خیر! میں نے آیت الکرسی پڑھی۔ سوچا کہ شاید وہم ہوا ہو گا اور کچھ گنگنانے لگا۔ پھر خیال آیا کہ اب سو جاتا ہے چنانچہ میں نے یونہی کہہ دیا۔ ارے یہ بجلی جل رہی ہے اسے تو بجھانا بھول ہی گیا۔ یہ کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ 'ٹک' سے آواز آئی اور کسی نے بجلی بجھا دی۔ اب جو میں اس کمرے سے ہڑبڑا کر بھاگا ہوں تو پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔۔۔۔“

”پھر کیا ہوا؟“ ایک طرف سے آواز آئی۔

"پھر ہم نے اس مکان کا کونا کونا تلاش کیا۔ پلنگ کے نیچے بھی دیکھا لیکن کچھ نہ ملا۔ سو یہ کمرہ آسیب زدہ ہے۔ اور ارے! یہ مرغی کہاں سے آگئی؟" شیطان نے ایک تاریک گوشے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اُفّوہ!" شیطان نے اچھلتے کودتے ہوئے کہا۔ "غضب خدا کا! یہ مجھے گُدگُدیاں کون کر رہا ہے؟" اور بے تحاشا چھلانگیں لگانے لگے۔

"۔۔۔اور یہ میرے کان میں چیخیں کون مار رہا ہے؟" شیطان چلّا کر بولے۔ "اور یہ پردے کے پیچھے سے اُونٹ کیوں جھانک رہا ہے؟"

اور کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ شیطان نے مجھے اشارہ کیا اور میں نے چپکے سے بجلی بجھادی۔ اب جو دھما چوکڑی مچی ہے تو الاماں! سب کے سب کمرے سے باہر نکل آئے اور برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ہم پہلی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ وہ مولانا بھی ساتھ تھے اور نیچے جھانک رہے تھے۔ غالباً انتظار تھا انہیں کسی کا۔ اتنے میں ایک تانگہ گزرا، مولانا چلّا کر بولے۔ "بھئی ٹھہرنا، تمہارا ٹانگی خالہ ہے کیا؟"

ادھر ٹانگے والے نے سُنا ہی نہیں، مجھے بڑی ہنسی آئی لیکن شیطان نہایت سنجیدگی سے بولے۔

"قبلہ! اگر آپ یوں فرماتے تو بہتر تھا کہ تمہاری خالہ ٹانگی ہے کیا؟"

مولانا جھینپ گئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر تھوڑا ہی کہا تھا، یونہی مُنہ سے نکل گیا۔ ویسے وہ ڈرے ہوئے تھے۔

ٹانگے کا انتظار ہوتا رہا۔ شیطان نے مولانا سے پوچھا۔ "کیوں صاحب آپ کی بجی میں کیا گھڑا ہے؟"

"بارہ بجنے والے ہیں۔" وہ بولے۔

"میرے خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ سڑک پر ٹانگہ ضرور مل جائے گا۔" اور ہم تینوں نیچے اترنے لگے۔

"قبلہ ان سیڑھیوں کے متعلق بھی ایک پراسرار قصّہ ہے۔ جسے میں اس اندھیرے میں سنانا نہیں چاہتا۔" اور مولانا اور بھی آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

"اجی آپ تو ہجے کر کر کے اُتر رہے ہیں۔ ذرا جلدی کیجئے۔" شیطان بولے۔

"ویسے ہی ذرا۔۔۔ چکنی سیڑھیاں ہیں کہیں۔۔۔۔" وہ کہنے لگے۔

"جی ہاں واقعی! سیڑھیاں اترتے چڑھتے وقت ضرور خیال رکھنا چاہیے کیونکہ پرسوں ہی کا ذکر ہے کہ میں جلدی جلدی زینے سے اتر رہا تھا۔ یکلخت جو ایک پھسلی سے سیڑھا تو دور تک سیڑھتا ہوا چلا گیا۔"

شیطان کو روپوں کی سخت ضرورت تھی۔ میرے پاس آئے، مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ میں اپنا جیب خرچ اور اسکالرشپ وغیرہ سب ختم کر چکا تھا۔ یہ طے ہوا کہ حکومت آپا ہمیشہ امیر رہتی ہیں ان سے ادھار لیے جائیں۔

شیطان حکومت آپا کے پاس گئے اور بولے۔ "ذرا باغ میں چلئے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" وہ متعجّب ضرور ہوئیں۔ باغ میں پہنچے۔ وہاں شیطان نے چٹکی بجائی اور بولے۔ "ارے! وہ تو وہیں کمرے میں کہنا تھا۔" اب پھر کمرے میں پہنچے۔ وہاں جاکر کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ "میں بھی کیا خبطی ہوں، دراصل وہ بات صرف چھت پر کی جاسکتی ہے۔" میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مختصر سی بحث کے بعد دونوں چھت پر پہنچے۔ وہاں جاکر شیطان نے التجا کی کہ اگر یہ بات دالان میں سنائی گئی تو بہتر رہے گا۔ اور حکومت آپا مچل گئیں۔ خیر! دالان میں پہنچے۔

"اب میں یہاں سے ہر گز نہ ہلوں گی۔" انہوں نے کہا۔

شیطان نے سر گوشی کی۔ "تم ان دنوں بہت اچھی معلوم ہو رہی ہو۔"

اور حکومت آپا فوراً بولیں۔ "روپے دراصل میرے پاس بھی نہیں ہیں۔"

شیطان بولے۔ "یقین کرو کہ تم بہت ہی اچھی معلوم ہو رہی ہو۔"

وہ بولیں۔ "یقین کیجئے کہ میں اس وقت بالکل قرض نہیں دے سکتی۔"

شیطان نے جلدی سے کہا۔ "قرض کون مسخرہ مانگتا ہے۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم پرسوں سے بہت حسین لگ رہی ہو۔ فقط پرسوں سے۔"

اسی طرح دیر تک الٹی سیدھی ہانکنے کے بعد حکومت آپا کو یقین دلا دیا کہ واقعی وہ سچ کہہ رہے ہیں۔ وہ شرما گئیں اور آہستہ سے بولیں۔ "کیا اچھا لگ رہا ہے آخر؟"

"خدا جانے کیا اچھا لگ رہا ہے، لیکن پرسوں سے میری حالت مخدوش ہے، محض پرسوں سے۔"

"پرسوں کیا بات تھی ایسی؟" وہ اور بھی شرما گئیں۔

"پرسوں جب تم اپنے کمرے میں بیٹھی بسور رہی تھیں تو بس اس وقت تم مجھے بہت ہی اچھی لگیں۔ میں اس انتظار میں رہا کہ تم روتی کب ہو، لیکن جب ایک آنسو بھی نہ نکلا تو میری آرزوؤں کا خون ہو گیا۔ کاش کہ تم بھوں بھوں کر کے روتیں۔ خیر اگلی مرتبہ جب بھی رونے کا پروگرام ہو مجھے ضرور بلانا۔"

اب تک ہمیں پتہ ہی نہ چل سکا کہ رضیہ ہر وقت کس کے متعلق سوچتی رہتی ہے۔ ویسے ہمیں یہ یقین تھا کہ اسے کسی نہ کسی کا خیال ضرور رہتا ہے۔ میری اور شیطان کی یہی بحث رہتی۔ وہ عجیب عجیب حرکتیں مجھ سے کرواتے۔ ایک روز بولے۔ "رضیہ کو مونچھیں پسند ہیں، مونچھیں رکھ لو۔" میں نے رکھ لیں۔ پھر بتایا۔ "اسے برابر کی مونچھیں پسند نہیں، ایک طرف کی بڑی ہو دوسری طرف کی چھوٹی ہو۔" میں نے کچھ روز اپنی ہنسی اُڑوائی۔ پھر کہنے لگے۔ "اسے مونچھیں پسند ہی نہیں۔" چنانچہ صاف کرا دی گئیں۔

ایک دن مجھے رضیہ کو اس کی کسی سہیلی کے ہاں چھوڑنے جاتا تھا۔ شیطان نے مشورہ دیا۔ "خوب اچھے سے کپڑے پہن کر جانا۔ رضیہ کے ساتھ چلو گے، شان رہے گی۔" میں پوچھ بیٹھا کہ رضیہ کو کسی قسم کا لباس پسند ہے؟ کہنے لگے۔ "تم

اس وقت جا کر سُرخ رنگ کی پتلون پہن لو اور سبز رنگ کا کوٹ، زرد رنگ کی ٹائی، براؤن جوتے، نیلی قمیض اور فاختی رنگ کا رومال۔ جاؤ ابھی پہن کر آ جاؤ۔"

اور جب میں اور رضیہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے تو جو بھی راستے میں ملتا، وہ نہ صرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے گھورتا بلکہ دیر تک مُڑ مُڑ کر دیکھا جاتا۔

آخر رضیہ سے نہ رہا گیا۔ "یہ آپ کو سوجھی کیا تھی؟"

"کیا؟"

"یہ لباس کیسا پہن آئے ہیں؟ بالکل ٹیکنی کلر (Techni Colour) میں رنگے ہوئے ہیں۔"

ایک دن شیطان نے نہایت لاجواب تجویز سوچی کہ ایک ڈراما سٹیج کیا جائے جو میرے نام سے مشہور کیا جائے۔ انتظام سارا شیطان کریں گے۔ تجویز معقول تھی۔ رضیہ پر تھوڑا سا رعب جمایا جا سکتا تھا۔

پورے مہینے بھر کی تیاریوں کے بعد ہم نے ایک رومان انگیز ڈراما تیار کر لیا۔ اب ڈرامے کے نام کا سوال آیا تو شیطان بولے۔ "اس کا نام 'بے گناہ اُونٹ' ٹھیک رہے گا۔"

"لیکن اس کا پلاٹ تو رومانی ہے اور اس میں اُونٹ کہیں بھی نہیں آتا۔"

"آج کل لوگ ایسے اچھوتے خیالات پر تو جان چھڑکتے ہیں۔۔۔۔ یہ بہترین نام ہے۔۔۔۔۔ ویسے اور نام بھی ہیں مثلاً مفلس عاشق۔۔۔۔ یا پریم کا جادو۔۔۔۔یا۔۔۔۔!"

اور میں فوراً مان گیا۔

"اچھا! اب اس کا عرف ضرور ہونا چاہیے۔ عرف کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ابھی میں نے ایک نہایت غم ناک اور درد انگیز رومانی افسانوں کی کتاب پڑھی ہے جس کا نام تھا آنسو اور ستارے عرف 'اس نے شرارت کی' اس عرف نے مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔"

"تو پھر رکھ لو عرف کیا رکھو گے ؟"

"میرے خیال میں تو یوں ٹھیک رہے گا۔۔۔۔ 'بے گناہ اُونٹ' عرف 'آ بیل مجھے مار'۔"

"لیکن اس میں بیل بھی کہیں نہیں آتا۔"

"پھر وہی باتیں کیں تم نے۔" شیطان نے ڈانٹا اور میں مان گیا۔

مجھے شہزادہ بنایا گیا۔ شیطان نے اپنا اصلی پارٹ کرنا قبول کر لیا یعنی وہ شیطان بنے۔ ایک صاحب پریوں کی شہزادی بنائے گئے اور ان کی حجامت اس بری طرح کی گئی کہ چہرہ کھرچ دیا گیا۔ آس پاس کے بیشتر معزز حضرات مدعو کیے گئے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک یار جنگ بہادر صاحب تشریف لا رہے تھے۔ ان کی آمد باعثِ فخر تھی۔ کلب میں ایک بہت بڑے ہجوم کے سامنے پردہ اُٹھا۔

مَیں ایک اندھیرے باغ میں کودا۔ وہاں جلدی سے پریوں کی شہزادی پر عاشق ہوا۔ پھر چاند کو طلوع ہونا تھا اور مجھے ایک درد انگیز تقریر کرنی تھی۔ اب میں عاشق ہو کر چاند کا انتظار کر رہا ہوں۔ اِدھر چاند ہے کہ نکلتا ہی نہیں۔ آخر تنگ آ کر میں نے بغیر چاند کے تقریر شروع کر دی۔ اتنے میں یکلخت چاند طلوع ہوا اور بڑی تیزی سے آسمان (اسٹیج) کو عبور کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ ایک قہقہہ پڑا۔ لیکن میں نے تقریر جاری رکھی۔ اب چپکے سے چاند پھر نکل آیا اور میں نے ایک گھٹنے کے بل جھک کر دہنا ہاتھ بڑھا کر کچھ کہنا شروع کیا ہی تھا کہ جو دیکھتا

ہوں تو چاند دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اب جو اس طرف مُنہ کرتا ہوں تو چاند اِدھر آ گیا۔ غرضیکہ میری اور چاند کی خوب آنکھ مچولی ہوئی۔

اسی طرح ایک نہایت خوشنما سین پر یکلخت سارے قمقمے بجھ گئے اور جب دوبارہ جلے تو سارا مزا کِرکِرا ہو چکا تھا۔ اب جو پردے کی مصیبت شروع ہوئی تو میں جھنجھلا اٹھا۔ جب کہیں اچھا سا سین آیا دھڑام سے پردہ گر گیا اور لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ خیر بڑی مصیبتوں کے بعد انٹرول ہوا۔ اب شیطان اسٹیج پر آ کر فرماتے ہیں۔ ”خواتین و حضرات! میں ڈرامے کے پروڈیوسر (میرا نام لے کر) کے متواتر اصرار پر ان کی طرف سے جناب ببّر یار جنگ بہادر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اسٹیج پر تشریف لا کر حاضرین کو ایک ٹھمری یا دادرا سُنائیں۔ نیز ہمارا طبلچی بہت ہوشیار ہے۔ خواہ کیسی ہی راگنی چھیڑیں ساتھ چل نکلے گا۔“

حاضرین دم بخود رہ گئے اور وہ یار جنگ بہادر صاحب مع اپنے کُنبے کے فوراً اُٹھ کر چلے گئے۔ اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ میں شیطان سے کچھ کہتا۔

پردہ اٹھا۔ ذرا سی دیر میں شیطان کا پارٹ شروع ہونا تھا۔ اب جو انہیں ڈھونڈتے ہیں تو وہ غائب ہو چکے تھے۔ بڑی پریشانی ہوگئی۔ طے ہوا کہ جلدی سے ایک اور شیطان بنایا جائے۔

سین یوں تھا کہ پریوں کی شہزادی باغ میں ٹہل رہی تھی اور اسے ایک گستاخ قہقہہ سنائی دیتا ہے۔ وہ چونک کر کہتی ہے۔ میں خوب سمجھتی ہوں کہ تو شیطان ہے اور مجھے ڈرانا چاہتا ہے، لیکن میں تجھ سے ہرگز نہیں ڈروں گی۔ یہ کہہ کر وہ ایک گانا گاتی ہے۔

قہقہہ نقلی شیطان سے لگوایا گیا۔ ہیروئن نے اپنے فقرے کہہ دیئے۔ یکلخت ایک دھماکا ہوا۔ اسٹیج کی چھت سے ایک شعلہ سا تڑپا اور دھم سے کوئی عجیب الخلقت چیز کودی۔ جس کا رنگ سبز تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو چنگاریاں دہک رہی تھیں۔ دو چمکیلے سینگ تھے۔ نوکیلے کان اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ نہایت ہیبت ناک شکل تھی۔ ہیروئن نے ایک دِلدوز چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔ ہم سب حیران رہ گئے۔ اب جو غور سے دیکھتے ہیں تو یہ اصلی شیطان یعنی روفی تھے جو اپنا میک اپ خود کر کے آئے تھے۔

ہیروئن اس قدر ڈری ہوئی تھی کہ اس نے ایک عجیب بے ڈھنگے سُر میں غلط گانا شروع کر دیا۔ "رس کے بھرے تورے نین" اس کا ترنّم بالکل انگریزی موسیقی معلوم ہو رہا تھا۔ شیطان نے نہایت ہیبت ناک آواز میں ہنسنا شروع کر دیا اور بے شمار بچّے چلّا چلّا کر رونے لگے۔ جو بچّہ روتا اسے گھر بھیج دیا جاتا۔

اب جو ڈراؤنی ایکٹنگ شیطان نے شروع کی ہے تو حاضرین پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب خواتین چلی گئیں۔

غرضیکہ شیطان نے دل کھول کر دھما چوکری مچائی۔ آخر میں تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ انہوں نے بلاوجہ خود ساختہ فقرے بولنے شروع کر دیئے اور ہر سین میں اسٹیج پر آنا شروع کر دیا، خواہ ان کا پارٹ ہو یا نہ ہو۔ پھر وہ سین آیا جس میں شیطان کو جادو کے منتر سے ہلاک کرنا تھا۔ میں نے منتر کئی مرتبہ پڑھا لیکن شیطان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے چپکے سے کہا۔ "اب مَر بھی جاؤ۔" پرامپٹر نے بھی کہا۔ "مَر جایئے روفی صاحب!" اسٹیج کے پیچھے سے آواز آئی۔ "مَر جایئے قبلہ۔" لیکن وہ پھر بھی نہ مَرے۔ آخر میں نے غصّے سے کہا۔ "مرتے ہو یا نہیں؟"

شیطان زور سے بولے۔ "نہیں مرتے۔" اور لوگ ہنسنے لگے۔

"اچھا تو یہ بات ہے! اُٹھوں پھر؟" میں سچ مچ اٹھنے لگا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شہزادوں کی شان کے شایاں نہیں کہ معمولی سے شیطان پر ہاتھ اٹھائیں۔ چنانچہ میں نے تالی بجائی۔ چند سپاہی آ گئے۔ ان سے کہا۔ "لے جاؤ اس شیطان کو، گرفتار کر کے قتل کر دو۔"

"جہنم میں بھیج دو۔" حاضرین میں سے کسی نے نعرہ لگایا۔

"ہاں قتل کر کے جہنم میں بھیج دو۔"

"نہیں جاتے ہم۔" شیطان نے اپنے لمبے لمبے نوکیلے ناخن دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو پھر۔۔۔۔۔لا حول ولا قوۃ!" میں نے زور سے کہا۔

اور شیطان یکلخت اُچھلے اور چھلانگ مار کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔

اس کے بعد مجھ پر چاروں طرف سے بوچھاڑ ہوئی۔ سب کچھ میرے ذمّے منڈھ دیا گیا۔ شیطان صاف بچ نکلے۔ حکومت آپا نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کچھ خبطی سا لڑکا ہوں ورنہ اس قسم کی حرکتیں کبھی نہ کرتا۔ اور یہ بھی کہا کہ ڈرانے

کے دوران میں رضیہ کو گھور رہا تھا۔ لیکن رضیہ کے متعلق پتا نہ چل سکا کہ یہ کس قدر ناراض ہوئی۔

کچھ روز بہت پریشانی رہی۔

پھر حکومت آپا کی سالگرہ پر ایک دعوت ہوئی۔ ان کی سہیلیاں آئیں۔ بزرگوں نے شمولیت سے عمداً پرہیز کیا۔ میں اور شیطان بھی شریک تھے۔ سب کے سب حکومت آپا کی الل ٹپ باتیں سُن رہے تھے اور برداشت کر رہے تھے۔ وہ اپنی کار کا ذکر بار بار کر رہی تھیں۔ جج صاحب چاہتے تو اچھی خاصی کار لے سکتے تھے۔ لیکن نہ جانے انہیں اس فضول سی موٹر سے کیا دلچسپی تھی جو اس پر بُری طرح فریفتہ تھے۔ ادھر ان کا سارا کُنبہ اسی چیز پر لٹّو تھا۔ لیکن ہمیں وہ زہر دکھائی دیتی تھی۔

آخر شیطان نے آہستہ سے کہا۔ "دیکھو حکومت آپا، اگر اب تم نے اپنی کار کے متعلق ایک لفظ بھی کہا ہے تو۔۔۔!" لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ بدستور اپنی کار کے قصیدے پڑھتی رہیں۔ اب شیطان اٹھ کھڑے ہوئے اور سب متوجہ ہو گئے۔ یہ گلا صاف کر کے بولے۔

"خواتین و حضرات! آج میں چند الفاظ اس چیز کے متعلق کہنا چاہتا ہوں جسے غلطی سے کار کہا جاتا ہے۔ جو قطعی طور پر بے کار ہے۔ اس میں جب تک چند سٹول، کرسیاں اور مونڈھے نہ رکھے جائیں یہ چلتی نہیں (وہ کار بہت ہی لمبی تھی) اور جب تک بیس پچیس آدمی نہ بیٹھیں اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ آپ اسے پٹرول سے ہرگز نہیں چلا سکتے۔ جب تک اس میں مٹّی کے تیل، سرسوں کے تیل اور دیگر چیزوں کا ایک خاص مرکّب نہ ڈالا جائے، یہ نہیں چلے گی۔ آپ اسے پہاڑ پر چڑھائیں تو فوراً چڑھ جائے گی، لیکن نشیب پر رُک جائے گی اور ہرگز نیچے نہیں اُترے گی۔ لہٰذا کچھ پتہ نہیں کہ یہ چلتی کب ہے اور ٹھہرتی کب ہے۔ اپنی مرضی کی مالک ہے۔ اس میں ہارن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی مشین کا آرکسٹرا آدھ میل سے سنائی دے جاتا ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر ہٹ جاتے ہیں۔ چوک کا سپاہی کانوں میں انگلیاں دے کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور جل تو جلال تو پڑھتا ہوا ایک طرف ہو جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچّوں کو سینے سے لگا لیتی ہیں۔ راہ گیر سہم جاتے ہیں اور دیر تک سہمے رہتے ہیں۔ ہمارے پڑوس میں اس چیز کا وہ رُعب ہے کہ بچّوں کو اس سے ڈرایا جاتا ہے کہ شرارت کرو گے تو وہ موٹر آ جائے گی۔ ایک دن اس میں دودھ سے بھرا ہوا برتن رکھا تھا۔ جب تین چار میل جانے کے بعد اٹھایا گیا تو دودھ پر مکھن تیر رہا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ پکنک پر جاتے وقت

ہم جلدی میں آئس کریم نہ بنا سکے۔ البتہ آئس کریم کی مشین میں دودھ برف وغیرہ بھر کر مشین کار میں رکھ لی۔ جب وہاں پہنچے تو نہایت ہی اعلیٰ درجے کی آئس کریم تیار ہو چکی تھی۔"

اب جو معتبر ذرائع سے اطلاعات ملیں تو میں مسرت سے بے قابو ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ رضیہ کو محض میرا خیال رہتا ہے۔ یہ کھینچی کھینچی ضرور لگتی ہے لیکن اس کی وجہ حکومت آپا ہیں۔

میں سیدھا شیطان کے پاس گیا اور کہا کہ اب تو ہمیں یقین ہو جانا چاہیے۔ میری حالت ان دنوں عجیب سی تھی جو کچھ شیطان کہتے فوراً یقین کر بیٹھتا۔ پہلے تو انہوں نے حسبِ معمول رضیہ سے بیزار کرانے کی کوشش کی۔ اس کے خیال سے باز آ جانے کے لیے کیا۔ جب میں نہ مانا تو کہنے لگے کہ "دنیا بہت وسیع ہے اور رضیہ کی نگاہ بھی کمزور ہے۔" میں پھر بھی نہ مانا تو انہوں نے ایک عجیب اوٹ پٹانگ سی تجویز بتائی کہ میں رضیہ کو باغ میں ملوں۔ واپسی میں اناروں کے جھنڈ کی طرف آؤں اور وہاں جو گڑھا ہے اس میں گر پڑوں اور بے ہوش ہو جاؤں۔ رضیہ ضرور سر دبائے گی۔ پھر غنودگی میں بڑبڑانے لگوں اور رضیہ سے اصل بات صاف صاف کہہ دوں بس اس وقت جو جواب ملے گا وہ آخری ہو گا۔

میں ہچکچایا۔ شیطان کہنے لگے۔ ”یہ آخری آزمائش ہے۔ اس مرتبہ ضرور فیصلہ ہو جائے گا۔ اس لیے ہمّت کر ہی ڈالو۔“ اور میں تیار ہو گیا۔ میں نے مُنّی کو جاسوس بنایا کہ جونہی رضیہ باغ کی طرف جائے مجھے فوراً اشارہ کر دے۔ اشارہ پاتے ہی میں بھاگا اور رضیہ کو باغ میں جالیا۔ پہلے تو اپنے ڈرامے کے متعلق پوچھا۔ بولی۔ ”کچھ ایسا بُرا نہیں تھا۔“ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب واپس آنے لگے تو میں اسے اناروں کے جھنڈ کی طرف لے گیا۔ اب وہ چھوٹا سا گڑھا آیا جہاں مجھے گرنا تھا۔ پگڈنڈی سے گڑھا دور تھا۔ اس لیے میں گھاس پر چلنے لگا اور یکلخت خواہ مخواہ ٹھوکر کھا کر گڑھے میں کچھ اس طرح گرا کہ سچ مچ چوٹ آگئی۔ دراصل گرنے کی ریہرسل نہیں کی گئی تھی۔

رضیہ گھبرا گئی۔ اس نے مجھے ہوش میں لانے کی ترکیبیں کیں۔ بے چاری فوّارے سے پانی بھی لائی۔ بھلا میں کہاں ہوش میں آنے لگا تھا۔ میں نے ہدایت نمبر تین کے مطابق سرگوشی میں کہا۔ ”رضیہ“ اور آنکھ جھپکا کر اسے دیکھا بھی۔

پھر آہستہ سے کہا۔ ”رضیہ!“ اور وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اب میرا سر دبایا جا رہا تھا۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا تھا، لیکن مارے ڈر کے برا حال تھا۔ پورے ایک منٹ کے وقفے کے بعد پھر کہا۔ ”رضیہ!“ اور رضیہ چپکے سے بولی۔ ”ہاں!“

اور میں جیسے آسمانوں میں اڑنے لگا۔ اب اس نے میرا سر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ فیصلہ کن جواب مل چکا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ناچنے لگوں۔ رضیہ کی انگلیاں بالوں سے کھیلتی کھیلتی گردن تک پہنچیں اور جو بے تحاشا گُدگُدی ہوئی ہے تو سارے جتن کر ڈالے۔ ہونٹ چبائے، چُٹکیاں لیں، بہتیرا ضبط کیا۔ لیکن وہ کم بخت گُدگُدی قابو میں نہ آئی۔ اور میں کھِلکھِلا کر ہنس پڑا۔ اب جو رضیہ ناراض ہوتی ہے تو بس!

چلتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین تھا کہ ڈراما ہو رہا ہے۔ بھلا اس تماشے کی کیا ضرورت تھی؟“

اور میں نے سوچا کہ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ گُدگُدی سب کو ہوتی ہے، کسی کو کم، کسی کو زیادہ۔ بس رنج تھا تو یہ کہ اب رضیہ کبھی مجھ سے بات نہ کرے گی۔

۔۔۔۔سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔

اگلی شام کو انتہائی اداسی میں شیطان کو سارا قصّہ سنایا۔ وہ بولے ”پہلے تو مجھے شُبہ تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے کہ رضیہ تمہیں پسند نہیں کرتی۔ اس میں رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اپنی اپنی پسند ہے۔ کوئی اچھا لگا کوئی نہ لگا۔ اور جب محبّت کا

جواب محبّت میں نہ ملے تو وہاں سے چلے جانا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر آب وہوا کی تبدیلی حیرت انگیز اثر رکھتی ہے۔ اب تمہیں یہاں رہ کر افسردگی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ بھئی تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ اور سمجھ لو کہ رضیہ کو بھی دیکھا بھی نہ تھا۔"

اور میں بھی اداس ہو گیا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جہاں بھی جاؤں گا بہت ہی غمگین رہا کروں گا کیونکہ مجھے رضیہ اچھی لگتی ہے۔ اسے ہرگز نہیں بھلا سکتا۔"

ہم اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آخر شیطان نے منوا کر چھوڑا کہ اس وقت یہی بہتر ہے کہ میں چُپکے سے چلا جاؤں بغیر جج صاحب کو اطلاع دیئے۔

"اور کالج کے سرٹیفکیٹ؟" مَیں نے پوچھا۔

"وہ سب میں بھیج دوں گا۔" شیطان نے وعدہ کیا۔ اور ذرا سی دیر میں مَیں سامان باندھ رہا تھا۔ شیطان میری مدد کر رہے تھے۔

اتنے میں حکومت آپا آ گئیں۔ پیچھے پیچھے ننھی تھی جسے یہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ میں نے جلدی سے صندوق بند کر دیئے۔

میری اور شیطان کی یہی خواہش تھی کہ یہ کسی طرح یہاں سے چلی جائیں۔ شیطان بولے۔ ”ننھی! دیکھ تو سہی ساتھ کے کمرے میں جو کلاک ہے وہ چل رہا یا نہیں؟“

ننھی نے واپس آ کر بتایا۔ ”کلاک چل تو نہیں رہا کھڑا ہے۔ بس اپنی دُم ہلا رہا ہے۔“

شیطان نے پھر پوچھا۔ ”تو گویا چل رہا ہے نا؟“

”چل کہاں رہا ہے؟ چل کس طرح سکتا ہے بیچارہ؟ میخوں سے تو گاڑ رکھا ہے۔ بس اپنی دُم ہلا رہا ہے۔“ ننھی نے وضاحت کی۔

حکومت آپا ہنس دیں۔

شیطان چڑِ گئے۔ ”یہ بڑی ہو کر ہو بہو حکومت بنے گی۔ شاباش ہے حکومت، کیا لاجواب ٹریننگ دی ہے اس بچّی کو۔ ستیاناس کر دیا۔“ وہ ابھی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ شیطان بولے۔ ”تمہیں چاہیے کہ اسے سارے سبق پڑھا کر ایک سرٹیفکیٹ دے دو۔ اس طرح۔۔۔ کہ میں نے پورے چار سال تک اس بچّی کو اپنے ساتھ رکھا اور اسے اچھی بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں بڑے فخر سے کہہ

سکتی ہوں کہ یہ ایک گستاخ چھچھوری، چٹوری اور ضدّی لڑکی بن گئی ہے۔ لوگوں پر خواہ مخواہ فقرے کسنے میں تو اس نے مجھے بھی مات کر دیا ہے۔ ہر ایک سے چھیڑ، بزرگوں کا حکم نہ ماننا، اپنا وقت ضائع کرنا، ان میں یہ ایسی ماہر ہو گئی ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی یہ جائے گی میرا نام روشن کرے گی۔ میری بدترین دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔" اس پر حکومت آپا نے ایک تیز سا جواب دیا اور باہر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ننھی بولی۔ "بھیّا! اب تو آپ حکومت آپا کو ڈانٹ لیتے ہیں۔ ذرا ان کی شادی ہو جانے دو، پھر دیکھیں گے انہیں کون دھمکاتا ہے۔"

"اچھا تو حکومت کی شادی بھی ہو گی؟۔۔۔ کون کہتا ہے؟" شیطان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اب حکومت آپا اُبل پڑیں۔۔۔ "اور تمہاری بڑی ہو گی؟ دیکھ لینا جو کوئی لڑکی تمہارے نزدیک بھی کھڑی ہو جائے تو! خواہ مخواہ رضیہ کو بھی پریشان کر رکھا ہے اور (میری طرف اشارہ کر کے) اس بیچارے کو بھی۔"

۔۔۔ اس پر میرے کان کھڑے ہو گئے۔

”حکومت تم جا کر کوئی مفرّح شربت پیو۔ تمہاری صحت۔۔۔۔!“

”مُجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم۔۔۔۔۔!“

”خاک تھا تمہیں پتا۔“

”اچھا تو کہہ دوں سب کچھ کہ تم نے بیچارے کو۔۔۔۔۔!“

”تم اپنا وقت بھی ضائع کر رہی ہو اور دوسروں کا بھی۔“

۔۔۔۔۔ اور شیطان اور حکومت آپا کی خوب لڑائی ہوئی۔ حکومت آپا نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔

مَیں نے شیطان کو کالر سے پکڑ لیا اور پوچھا۔ ”کیا سچ مچ تم رضیہ کو میرے خلاف ورغلاتے رہے ہو؟“

وہ بولے۔ ”ہاں!“

”ڈرامے میں تم نے ہی گڑبڑ کی تھی؟ اور خودکُشی تم نے ہی خراب کرائی تھی؟“

”ہاں! ہاں!“

"اور وہ۔۔۔۔!"

"ہاں! ہاں!! ہاں!!! مَیں نے سب کچھ کیا تھا اور ابھی بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ رضیہ تمہیں بالکل پسند نہیں کرتی اور اس کی نظر بھی کمزور ہے۔"

مَیں نے شیطان کو اپنی طرف کھینچا اور اپنا مکّا۔۔۔۔۔

اتنے میں جج صاحب آ گئے، وہ مُسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے "میں نے سب کچھ سُن لیا ہے، بیٹھ جاؤ۔ جب میں یورپ میں تھا تو وہاں ایک لڑکے سے میری کھٹ پٹ ہو گئی۔ ہمارے پروفیسر نے ہمیں جھگڑتے دیکھ لیا اور کہا کہ تم دونوں کے دِلوں میں غبار ہے جسے نکال دینا نہایت مفید ہو گا۔ تم کسی نہ کسی دن آپس میں لڑو گے ضرور۔ چنانچہ وہ ہمیں کھیل کے میدان میں لے گئے اور وہاں Gloves پہنا کر مکّہ بازی کرائی۔ ہم خوب لڑے یہاں تک کہ دونوں تھک کر گر پڑے اور ہم جب واپس آئے تو بڑے اچھے دوست بن گئے تھے۔ اب تم دونوں ضرور آپس میں لڑو گے۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ہم سب باغ میں چلیں تمہارا فیصلہ وہاں ہو جائے گا۔" انہوں نے گلوز منگا لیے اور ہم سب کمرے سے باہر نکل آئے۔ نہایت ہی دلفریب چاندنی رات تھی۔ میں بے حد اداس تھا۔ ہر دفعہ قصور میرا ہی نکلتا ہے۔ جہاں جاتا ہوں کوئی نہ کوئی گُل کھلاتا ہوں۔

مجھے چاہیے تھا کہ چپ چاپ یہاں سے چلا جاتا۔ جب رضیہ کو مجھ سے نفرت ہے تو پھر باقی کیا رہ گیا۔ اب یہ بات سب میں پھیل جائے گی۔ اور تو اور جج صاحب نے بھی سب کچھ سُن لیا۔ توبہ! توبہ! ایک تماشا اور باقی رہ گیا تھا سو وہ اب ہو رہا ہے۔ بس میں رات کی ٹرین سے گھر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی مُنہ نہ دکھاؤں گا۔

پلاٹ میں بجلی کے قمقمے جل رہے تھے۔ طے ہوا کہ وہاں مقابلہ ہو۔ ہمیں گلوز پہنائے گئے۔ جج صاحب نے گھڑی ہاتھ میں لی۔ ہمارے چاروں طرف سارا کُنبہ کھڑا تھا۔ جج صاحب نے پوچھا "کتنے راؤنڈ" میں نے کہا۔ "جتنے آپ چاہیں؟" شیطان بولے۔ "تین۔" جج صاحب نے کہا۔ "تین میں تو فیصلہ نہیں ہو گا پانچ سہی۔"

پہلا راؤنڈ شروع ہوا۔ نہ جانے میرے ہاتھ پاؤں کیوں شل ہو رہے تھے؟ بغیر کسی مدافعت کے شیطان سے پِٹ رہا تھا۔ سب بچّے میری طرف تھے اور ہمّت بندھا رہے تھے۔ رضیہ ایک طرف اکیلی کھڑی تھی۔۔۔۔ بالکل چپ چاپ۔

پہلا راؤنڈ شیطان کا رہا۔ دوسرے میں پھر انہوں نے پیٹنا شروع کیا اور میں بُت بنا کھڑا تھا۔ یہاں تک کہ میرا ایک مکّا بھی ان کو نہ لگ سکا۔ بچّے چلّا چلّا کر میرا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ شاید یہی

کہ مقابلہ ختم ہوتے ہی فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ایک ٹرین رات کے گیارہ بجے جاتی ہے۔

تیسرے راؤنڈ میں بھی یہی ہوا۔ شیطان اُچھل اُچھل کر حملہ کرتے اور میری جانب سے مدافعت تک نہ ہوتی۔ تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ رضیہ نے میرے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "سچ۔"

بولی۔ "ہاں"

اور میری آنکھوں کے سامنے تتلیاں ناچنے لگیں۔ میں اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چوتھا راؤنڈ شروع ہوا۔ میرے گلوز نے حرکت کی۔ دھڑام۔۔۔۔۔۔ دھڑام۔۔۔۔۔۔ دھڑام۔ چند آوازیں آئیں اور شیطان بے ہوش پڑے تھے۔ وہ ناک آؤٹ ہو گئے تھے۔ جج صاحب نے میرا بازو ہوا میں بلند کر کے ہلا دیا اور رضیہ میرے گلوز اُتارنے لگی۔

حکومت آپا بولیں۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا۔۔۔!"

میں اور رضیہ فوّارے کے پاس سے گزر رہے تھے۔ راستے میں ہم نے وہ گڑھا بھی دیکھا جہاں میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم دونوں مُسکرانے لگے۔ نہایت

ہی دلفریب چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ایسی چاندنی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ میں نے سوچا کہ رضیہ نہایت ہی خوبصورت لڑکی ہے اور ایسی لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور جب ہم معطّر پھولوں کے تختوں میں سے گزرے تو فضا میں ایک سناٹا تھا۔۔۔۔خوشگوار سناٹا۔ تب مجھے پتہ چلا کہ شیطان تو میرے رقیب تھے اور حکومت آپا اپنا وقت بھی ضائع کر رہی تھیں اور دوسروں کا بھی۔

ختم شد